www.urducouncil.nic.in

اگست 2022، قیمت :- ₹10

ماهنامه

بچوں کی دنیا

نئی دہلی

Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

بچوں کے قلمکاروں کے لیے سوالنامہ

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں بچوں کے قلمکاروں سے انٹرویوز کا سلسلہ شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کو قلمکاروں اور کتابوں کے بارے میں معلومات کے ساتھ ساتھ اپنا مستقبل اور کریئر بہتر بنانے کے لیے نئی روشنی اور نئی راہ بھی مل سکے۔
یہ ادارے کی طرف سے تیار کردہ سوالات ہیں، ان کے جوابات ادب اطفال سے جڑا ہوا کوئی بھی قلمکار دے سکتا ہے۔

1 بچپن کی کون سی باتیں/شوخیاں/شرارتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟
2 بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنّفین کون تھے اور اب کون ہیں؟
3 بچپن میں کس کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟
4 بچپن میں بچوں کے کون سے رسائل آپ پڑھتے تھے؟
5 بچوں کے ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟
6 زبان و بیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنّفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہو سکتی ہیں؟
7 مستقبل اور اپنے کریئر کو سنوارنے کے لیے بچوں کو کن موضوعات اور کتابوں کا مطالعہ کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا؟

---

8 اپنے سوانحی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں؟
9 آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟
10 آپ کی پہلی تخلیق، کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی؟
11 آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟
12 کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟
13 بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آپ کو کس طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟
14 ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقے میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟
15 کیا آپ اب بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟
16 انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہو سکتے ہیں؟
17 کیا اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا کوئی مکمل رسالہ موجود ہے؟
18 بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہو رہے ہیں، ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
19 معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟
20 بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟
21 بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے!
22 ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟
23 بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام!

* جوابات کے ساتھ پاسپورٹ سائز تصویر اپنی کتابوں کا عکس ضرور ارسال کریں۔

اس شمارے میں

اداریہ	مدیر	04
ڈاک خانہ	قارئین	05
مضامین		
لفظ بچہ کی قانونی تعریف...	خواجہ عبدالمنتقم	06
سمبل	محمد مستمر	10
ڈاکٹر ذاکر حسین	غضنفر اقبال	13
مانس	نسیم سعید	16
آزادی کا امرت مہوتسو		
یوم آزادی	عائشہ ثمن	21
آزادی کے دیوانوں کی کہانیاں	رونق جمال	22
یہ میرا ہندوستان	خلیق الزماں نصرت	24
آزاد بھارت اور ہم	ترنم جہاں شبنم	25
ترنگا ہمارا	خالد سرحدی	27
یوم آزادی	شکیب تائب ابن شمشاد راضی	27
انٹرویو		
بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر نظر رکھنا ضروری ہے : عبدالعزیز عرفان		28
نظمیں		
چھتری	کلیم ضیا	32
برسات کا موسم	وزیر عالم	33
اردو	عبدالرزاق دل کھولا پوری	33
ساتھی	شاہد انور	34
بچوں کے دوہے	جاوید رانا	34
آنکھ کھلتے ہی	ارم نعیم	35
زمین کا تحفظ	سمی اقبال	36
لوری	ساحر نصرت	37
میں آم ہوں	خطاب عالم	38
بچوں کے بڑے ادیب		
ڈاکٹر ایم اے حق اور بچوں کی مختصر کہانیاں	محمد علیم اسماعیل	39
کہانیاں		
اصلی سونا	بانو سرتاج	42
پرندوں کی محبت	سید تنویر احمد زاہدی	44
مدد کرو کمپیوٹر	ذاکر علی رجنیش	47
دوستی	عبدالرحمن شافی	50
بچوں کا کتب خانہ		
ہنستا پان بولتی چھالیہ	عابد معز	52
سائنس نامہ		
وائلڈ لائف	اکبر خان اشک جالوری	54
صحت اطفال		
ورزش		56
زبان شناسی		
لفظوں کو ملا کر لکھنا		59
کہکشاں		
چمن چمن کے پھول		61
ننھے فنکار		
پینٹنگ		62

بچوں کی دنیا

جلد: 10 شمارہ: 08 اگست 2022

مدیر: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مدیر منتظم: شاہنواز محمد خرم

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند
فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000
شعبہ ادارت: 11-49539009

ای میل
bachonkiduniya@ncpul.in
editor@ncpul.in

ویب سائٹ
http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آرڈر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتہ پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت
ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم
نئی دہلی-110066
فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

علاقائی مرکز: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدر آباد-500002
فون: 040-24415194

پیارے بچو! 15 اگست 1947 کو ہمارا ملک آزاد ہوا، اس لیے 15 اگست کو ہم نہایت تزک و احتشام کے ساتھ یوم آزادی کے طور پر مناتے ہیں۔ آزادی بہت بڑی نعمت اور ہر انسان کا بنیادی حق ہے۔ جب تک انسان کی سوچ آزاد نہیں ہوتی، تب تک ایک صحت مند معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا اسی لیے ہر ملک اور ہر معاشرے میں آزادی کی بڑی قدر و قیمت ہے۔

بچو! آپ کو تو یہ معلوم ہی ہوگا کہ ہمارے ملک عزیز ہندوستان کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لیے یہاں کے تمام طبقات سے تعلق رکھنے والوں نے بڑی قربانیاں دی ہیں، انگریزوں کے ظلم وستم سہے ہیں، قید و بند کی تکلیفیں برداشت کی ہیں، کتنے مجاہدین پھانسی پر چڑھائے گئے، کتنی ماؤں نے اپنے لاڈلوں کو کھویا، تب جا کر ہمیں آزادی جیسی عظیم نعمت ملی۔ مجاہدین آزادی نے اگر اپنی جان کی پرواہ کی ہوتی تو شاید ہی یہ ملک آزاد ہو پاتا۔ ان لوگوں نے اپنے ملک کے لیے اپنی جان نچھاور کیا تبھی انگریز یہاں کے عوام کی جرأت اور حوصلے سے ہار کر یہاں سے نکلنے پر مجبور ہوئے، ورنہ اب تک ہندوستان پر قابض رہتے۔ انگریزوں کے قبضے سے ملک کو آزاد کرانے کے لیے جہاں ہمارے جانباز مردوں نے انقلابی کردار ادا کیا وہیں خواتین بھی اس لڑائی میں پیچھے نہیں رہیں۔ انھوں نے ڈٹ کر انگریزوں کا مقابلہ کیا۔ ان جانباز خواتین کی داستان آپ پڑھیں گے تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے کہ نحیف اور کمزور کہے جانے کے باوجود ان عورتوں نے شجاعت اور شہامت کی ایک نئی تاریخ رقم کی۔

بچو! 15 اگست کے دن ہم لوگ مجاہدین آزادی کو یاد کرتے ہیں، ان کی جدو جہد اور قربانیوں کو خراج پیش کرتے ہیں، ان کے کارناموں پر فخر کرتے ہیں، کیونکہ ان کے کارناموں سے ہمیں تحریک ملتی ہے، ہمارے اندر ملک سے محبت کا ایک نیا جذبہ جنم لیتا ہے۔ آزادی کا جشن ہم ہر سال مناتے ہیں، آزادی کا امرت مہوتسو کے عنوان سے تقریبات منعقد ہو رہی ہیں یہ ہمارے لیے بہت فخر اور مسرت کی بات ہے۔ اس موقعے پر ہمارے لیے ضروری ہے کہ مجاہدین آزادی نے ہمیں محبت، بھائی چارہ، اتحاد و یگانگت کا جو پیغام دیا ہے اسے لوگوں تک پہنچائیں اور ملک میں محبت کی فضا قائم کریں اور ملک پر اگر کوئی مصیبت یا آفت آئے تو ہم سب مل کر اس کی سربلندی کے لیے کوشش کریں۔ اگر ہم لوگوں میں اتحاد قائم رہا تو ہمارے ملک کو کوئی آنکھ دکھانے کی ہمت نہیں کرسکتا۔ ہمارے لیے ملک کی سلامتی اور اتحاد بہت اہم ہے، ہمیں اپنے ملک کی سربلندی کے لیے اگر جان کا نذرانہ بھی دینا پڑے تو ہم خوشی خوشی اپنی جان نچھاور کردیں گے۔ یہ جذبہ ہر ہندوستانی کے دل میں ہے۔

پیارے بچو! ہم نے آزادی کا امرت مہوتسو کے تحت آزادی سے متعلق کئی تحریریں 'بچوں کی دنیا' میں شامل کی ہیں، ان نگارشات کا ضرور مطالعہ کریں۔ 'چمن چمن کے پھول' میں بھی آزادی اور وطن کی محبت کے حوالے سے بہت اچھے اشعار دیے گئے ہیں، آپ انھیں پڑھیں گے تو پتہ چلے گا کہ ہمارے شاعروں نے ملک سے محبت اور وفاداری کے جذبے کو کتنی خوبصورتی سے اپنے شعروں میں پیش کیا ہے۔

آپ کا

ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

ڈاک خانہ

’بچوں کی دنیا‘ مئی 2022 موصول ہوا، جو نہایت ہی دیدہ زیب و خوبصورت ہے کہ سب کی نظر جذب کرلے اور سب کے سب اس میں کھو سے جائیں۔ آپ نے گویا کسی چمن زار کو اک حسین اور معطر گلدستہ میں آراستہ و پیراستہ کر دیا ہو جیسا کہ دریا کو کوزہ میں بند کیا جاتا ہے۔ آپ کی ترتیب و مہارت کے کیا کہنے۔ بچوں کے اس حسین اور گھنے پودے کے اکتیس شاخسانے ہیں جن میں لکھنا پڑھنا، عید برات، پیڑ پودے، معلومات کھیل کود، ہنسی مذاق، سب کچھ جمع ہیں لیکن بطور خاص ’لکھنے کا فن‘ (ص6) ’ذہین ملکہ‘ (ص35)، ’تین تحفے‘ (ص47) اور نظمیں وغیرہ بہت ہی اچھے لگے۔ اس پُر بہار گلدستے کی پیش کش پر آپ کو بہت بہت مبارک باد۔

مصطفیٰ ندیم خاں غوری، بی11، گرین ویلی، روضہ باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

ماہنامہ ’بچوں کی دنیا‘ مجھے بہت پسند ہے۔ تقریباً تین سال سے مستقل میں یہ رسالہ پڑھتا ہوں۔ اس رسالہ کے متعلق پہلی بار میں نے اپنی بہن سے سنا تھا۔ شروع شروع میں اسے سمجھنا میرے لیے مشکل تھا، لیکن دھیرے دھیرے میں اسے بخوبی سمجھنے لگا، کیرالہ میں بھی ’چشمہ اردو‘ کے نام سے ایک رسالہ نکلتا ہے، لیکن یہ اتنا معیاری نہیں ہے۔ ہر شمارے کو میں ایڈیٹوریل سے پڑھنا شروع کرتا ہوں اور اخیر تک پڑھتا چلا جاتا ہوں۔ میں نے کئی بچوں سے کہا کہ وہ بھی بچوں کی دنیا کا ضرور مطالعہ کریں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے کالج میں انیس بچے اس رسالے کو ہر ماہ خرید کر پڑھتے ہیں، مجھے امید ہے کہ مستقبل میں یہ تعداد اور بڑھے گی۔

محمد اجمل المتل، بخاری کالج، ملاپورم، کیرالہ

لفظ 'بچہ' کی قانونی تعریف اور انھیں دستیاب حقوق و سہولیات

خواجہ عبدالمنتقم

بچو! ہم نے اپنے اس مضمون میں آپ کو یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ بچہ کسے کہتے ہیں، آپ اپنے آپ کو کس عمر تک بچہ سمجھ سکتے ہیں، آپ سے کس عمر تک کس طرح کا کام لیا جاسکتا ہے اور آپ کو کون کون سے حقوق و سہولیات حاصل ہیں؟ اس مضمون میں شامل کچھ باتیں ایسی ہیں جو آپ خود سمجھ جائیں گے اور کچھ آپ کے والدین یا استاد آپ کو سمجھا سکتے ہیں۔

ایک عام آدمی کی نظر میں ہر کمسن یا نابالغ، بچہ ہوسکتا ہے لیکن قانون کی نظر میں ایسا نہیں ہے۔ ایک قانون کی نظر میں آج پیدا ہونے والا بھی بچہ ہے لیکن قانون کی نظر میں 21 سال سے کم عمر کے شخص کو بھی بچہ کہا جاسکتا ہے۔ جہاں تک بچے کی قانونی تعریف کا سوال ہے بھارت کے آئین میں اس اصطلاح کی کوئی تعریف نہیں کی گئی ہے مگر بچوں کا مختلف دفعات میں حوالہ یا ذکر ضرور ہے۔ البتہ ہمارے ملک کے مختلف قوانین میں ان کی نوعیت کے حساب سے اس کی الگ الگ تعریف کی گئی ہے یا عمر کا حوالہ دیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے کیا کیا کام کرائے جاسکتے ہیں۔ ان کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

- بچوں کی شادی کی ممانعت قانون، 2006 میں نافذ کیے گئے قانون کے مطابق بچہ سے ایک ایسا شخص مراد ہے، جو اگر مرد ہے تو اس کی عمر 21 سال سے کم ہو اور اگر عورت ہے تو وہ 18 سال سے کم عمر کی ہو۔ اس قانون کا مقصد بچوں کی شادی پر پابندی لگانا ہے۔
- کمسن افراد کے ساتھ انصاف (بچوں کی دیکھ بھال وتحفظ) قانون، 2015 میں بنائے گئے قانون میں ہر اس شخص کو بچہ قرار دیا گیا ہے جس کی عمر 18 سال سے کم ہو۔ یہ قانون، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے، کمسن افراد کی بھلائی اور ترقی کے لیے بنایا گیا ہے۔
- بچوں کو جنسی جرائم کے خلاف تحفظ فراہم کرنے سے متعلق قانون، 2012 میں بنائے گئے قانون کے تحت ہر وہ شخص بچہ ہے، جس کی عمر 18 سال سے کم ہو۔
- قانون بلوغت، 1875 یعنی بالغ قرار دیے جانے کی عمر سے متعلق قانون میں بھی یہی معیار اپنایا گیا تھا یعنی ہر وہ شخص جس کی عمر 18 سال سے کم ہے اسے بچہ یعنی نابالغ سمجھا جائے گا لیکن اگر کسی نابالغ بچے اور اس کی جائیداد کے لیے کسی

ولی کا تقرر کیا جاتا ہے یا جس کی جائیداد کو نابالغ افراد کے تحفظ کے لیے بنائی گئی عدالت(Court of Wards) کی نگرانی میں رکھا جاتا ہے تو اس صورت میں اس کے بالغ ہونے کی عمر 21 سال ہوگی۔

- بچہ مزدور (ممانعت وضابطہ بندی) قانون، 1986 میں صرف اس شخص کو بچہ سمجھا جائے گا جس کی عمر ابھی 14 سال نہ ہوئی ہو اور اگر وہ 14 سال کا ہو چکا ہے لیکن 18 سال کا نہیں ہوا ہے تو اسے نوعمر (Adolescent) سمجھا جائے گا۔ یہ قانون بنانے کی واحد غرض یہ ہے کہ کم عمر کے بچوں سے ایسا کام نہ لیا جائے جس کا کرنا ان کے لیے مناسب نہیں ہے۔
- کارخانہ ایکٹ، 1948 میں صرف اس شخص کو بچہ سمجھا جائے گا جس کی عمر ابھی 15 سال نہ ہوئی ہو اور نوعمر اسے سمجھا جائے گا جو 15 سال کا ہو چکا ہے لیکن 18 سال کا نہیں ہوا ہے۔
- بیڑی اور سگار کارکنان (ماموری کی شرائط) قانون، 1966 میں صرف اس شخص کو بچہ سمجھا جائے گا جس کی عمر ابھی 14 سال نہ ہوئی ہو۔ یہ قانون بیڑی بنانے والے اداروں میں کام کرنے والے مزدوروں کی بھلائی کے لیے بنایا گیا ہے۔
- اسی طرح باغات مزدور ایکٹ، 1951 کے تحت صرف اس شخص کو بچہ سمجھا جائے گا جس کی عمر ابھی 15 سال نہ ہوئی ہو۔ یہ قانون باغات میں کام کرنے والے مزدوروں کی بھلائی کے لیے بنایا گیا ہے۔

موٹر ٹرانسپورٹ کارکنان ایکٹ، 1961 کے تحت اس شخص کو بچہ سمجھا جائے گا جس کی عمر ابھی 15 سال نہ ہوئی ہو۔

قانون کے تحت کتنی عمر والے بچوں سے کیا کام لیا جا سکتا ہے؟

بچوں سے مزدوری کرانے سے متعلق 1986 میں بنائے گئے قانون میں مندرجہ ذیل باتیں شامل ہیں:

- کسی بھی بچے سے کسی بھی دن تب تک تین گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کرایا جائے گا جب تک کہ اسے بیچ میں کم سے کم آرام کے لیے ایک گھنٹہ کا وقفہ نہیں دیا جاتا۔ اس کے علاوہ وقفہ کو اور کام کے لیے انتظار پر ضائع ہونے والے وقت کو ملا کر کام کے اوقات ایک دن میں 7 گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ کسی بھی بچے سے شام کے سات بجے کے بعد اور صبح کے آٹھ بجے تک کوئی کام نہیں کرایا جائے گا اور کسی بھی بچے سے کام کے اوقات سے زیادہ کام نہیں لیا جائے گا۔
- ہفتے میں کم سے کم پورے ایک دن کی چھٹی دی جائے گی۔
- بچوں کے کام کی نوعیت کو دھیان میں رکھتے ہوئے صفائی، روشنی، نمی، پینے کا پانی، بیت الخلا، پیشاب گھر، دھماکہ خیز اشیا و آگ سے حفاظت، عمارت اور مشینری کے تحفظ وغیرہ کی بابت قواعد بنائے جائیں گے۔
- اگر بچوں سے کوئی ایسا کام کراتا ہے جس کو بچوں سے کرانے کی اجازت نہیں ہے تو اسے قید ہو سکتی ہے، اس پر جرمانہ ہو سکتا ہے اور اگر وہ پھر بھی باز نہیں آتا تو اس کی سزا بڑھائی جا سکتی ہے۔

باغات مزدور ایکٹ، 1951 میں یہ بات کہی گئی ہے کہ بچوں سے صرف صبح چھ بجے سے شام کے سات بجے کے دوران ہی کام کرایا جا سکتا ہے۔ اس قانون کی رو سے 12 سال سے کم عمر کے بچے کو باغات میں کام کرنے کی اجازت نہیں ہوگی۔

کارخانہ ایکٹ، 1948 میں مندرجہ ذیل باتیں شامل ہیں:

- کسی بھی بچے سے ایک دن میں ساڑھے چار گھنٹے سے زیادہ کام نہیں کرایا جائے گا اور نہ ہی اس سے رات میں کوئی

کام لیا جائے گا۔ اسی طرح بچوں کو مختلف شفٹوں میں کام کرنے کی بابت صحیح نظام قائم کرنے کی بات کہی گئی ہے۔

- ہر اس کارخانے میں جہاں بچے ملازم ہیں ایک نوٹس لگایا جائے گا جس میں صاف طور پر یہ بات درج ہوگی کہ بچے روزانہ کتنے گھنٹے کام کریں گے۔
- بال مزدوروں کی بابت ایک رجسٹر رکھا جائے گا جس میں کارخانے میں کام کرنے والے ہر بچے کا نام، اس کے کام کی نوعیت، وہ گروپ جس میں اس کو رکھا گیا ہے، شفٹ کی تفصیل اور صحت مندی سرٹیفکٹ کا نمبر درج ہوگا۔
- جو ماں، باپ، ولی یا وہ شخص جس کی تحویل میں وہ بچہ ہے، کسی بچے سے دوہری مزدوری کرائے گا تو اس پر جرمانہ لگایا جائے گا۔ البتہ اگر عدالت کو یہ اطمینان ہوجاتا ہے کہ اس بچے نے یہ کام ان میں سے کسی کے دباؤ کے بغیر کیا ہے تو ان پر جرمانہ نہیں لگایا جائے گا۔

بیڑی اور سگار کارکنان (ماموری کی شرائط) ایکٹ، 1966 میں یہ بات کہی گئی ہے کہ کسی بھی بچے سے صنعتی ادارے میں کام نہیں کرایا جائے گا۔ اس قانون کے تحت کمسن افراد سے صرف صبح چھ بجے سے شام کے سات بجے کے دوران ہی کام لیا جاسکتا ہے۔

موٹر ٹرانسپورٹ کارکنان ایکٹ، 1961 میں یہ بات صاف طور پر کہی گئی ہے کہ کسی بھی موٹر ٹرانسپورٹ ادارے میں کسی بچے سے کسی بھی طرح کا کوئی کام نہیں لیا جاسکتا۔

بندھوا مزدور نظام ختم کرنے سے متعلق 1976 میں بنائے گئے قانون کے ذریعے بندھوا مزدور نظام کا خاتمہ کردیا گیا ہے۔ اب کسی سے جبراً بندھوا مزدور کی حیثیت سے کام نہیں لیا جاسکتا۔ اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو قید ہوسکتی ہے اور اس پر جرمانہ بھی لگایا جاسکتا ہے۔

ہر مہذب سماج میں ہر بچے کو کم از کم مندرجہ ذیل حقوق و سہولیات حاصل ہونی چاہئیں:

- بچے کو ہر بنیادی سہولت حاصل کرنے کا حق حاصل ہے اور وہ ہر اس اچھی چیز تک رسائی کا حقدار ہے جو اسے بہتر زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہو۔
- ہر بچے کو تعلیم حاصل کرنے اور کھیل کود میں حصہ لینے کا حق حاصل ہے۔

ہر بچے کو اپنی نوعمری کے زمانے میں معقول پابندیوں کے تابع ہر خوش کن اور باعث تفریح ذریعہ سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملنا چاہیے۔

بچے کی ایسی صحیح نشو ونما ہو جس سے اس میں انسانوں سے محبت اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوتا کہ وہ بڑا ہو کر ایک ذمے دار شہری کے طور پر سول سوسائٹی کی خدمت کر سکے۔

کسی کو بچے پر غصہ ہونے کا حق حاصل نہیں، بچے کو تو محبت وشفقت درکار ہوتی ہے۔ اگر کوئی بچہ ایسے ماحول میں جنم لیتا ہے یا ایسے ماحول میں پل کر بڑا ہوتا ہے جہاں تناؤ، بے چینی، کشاکش اور بے سکونی ہو یا جذباتی گرم جوشی کی کمی اور اسے پوری توجہ نہ ملے تو اس کا اس کے دماغ اور نشو ونما پر منفی اثر پڑتا ہے۔

ہر یتیم یا ولی نہ ہونے کی صورت میں بھی بچے کو اس بات کا پورا پورا حق حاصل ہے کہ اس کی حفاظت کی جائے اور اسے بھی عام بچوں کی طرح تمام سہولیات دستیاب ہوں۔

ہر بچے کو آزادی اور پرامن وغیر آلودہ ماحول میں زندگی گزارنے کا حق حاصل ہے۔

بھارت کے آئین میں بچوں کو تحفظ

6 سال سے چودہ سال تک کی عمر کے بچوں کے لیے مفت اور لازمی تعلیم کا انتظام۔

ابتدائی درجے میں مادری زبان میں تعلیم دینے کی سہولیات دستیاب کرانا متعلقہ افسران کی ذمے داری ہے۔ ہمارے ملک کی نئی ایجوکیشن پالیسی میں بھی یہ بات کہی گئی ہے کہ جہاں ممکن ہو وہاں کم از کم پانچویں جماعت تک اور ترجیحی طور پر آٹھویں جماعت تک اور اس کے بعد ذریعہ تعلیم گھریلو زبان (Home Language) مادری زبان/ مقامی زبان / علاقائی زبان میں ہی ہونی چاہیے۔ Home language سے مراد ہے وہ زبان جو کسی خاندان کے لوگ عام طور پر گھر میں بولتے ہیں۔ اسے Family language بھی کہا جاتا ہے۔ اس پالیسی میں یہ بھی التزام ہے کہ جہاں ممکن ہو وہاں مقامی/ گھریلو زبان کو بطور ایک زبان پڑھانا جاری رکھا جائے۔

بچوں کو صحت مند طریقہ سے اور آزاد و پروقار ماحول میں پڑھنے کے مواقع اور سہولتیں فراہم کرانا اور کسی بھی طرح کے استحصال سے محفوظ رکھنا۔

بچوں اور بڑوں سبھی کو اپنی الگ جدا گانہ زبان، رسم الخط یا ثقافت کو محفوظ رکھنے کا حق۔ صرف یہی نہیں بلکہ کسی بھی شہری کو، جس میں بچے بھی شامل ہیں، ایسے تعلیمی ادارہ میں جسے سرکار چلاتی ہو یا جسے سرکار سے امداد ملتی ہو، کسی بھی کورس میں کسی بھی بچے کو داخلہ دینے سے محض مذہب، نسل، ذات، زبان یا ان میں سے کسی کی بنا پر داخلہ دینے سے انکار نہیں کیا جا سکتا بشرطیکہ وہ اس کورس میں قانونی طور پر داخلہ لینے کا اہل ہے۔

14 سال سے کم عمر کے کسی بچے سے کسی کارخانے یا کان میں کام نہ کرانا اور نہ ہی کسی دوسرے خطرناک کام میں لگانا۔

بچوں کی کم سنی سے بے جا فائدہ نہ اٹھانا اور انھیں ایسا کام کرنے پر مجبور نہ کرنا جو ان کی عمر یا طاقت کے لحاظ سے نامناسب ہو۔

{جنوری 2021 کے شمارے میں ان کا تعارف شائع ہوچکا ہے}

■

Khwaja Abdul Muntaqim
H-3, Dharma Apartment, 2-I,P Extn.
Delhi- 110092
Mob: 9818369624

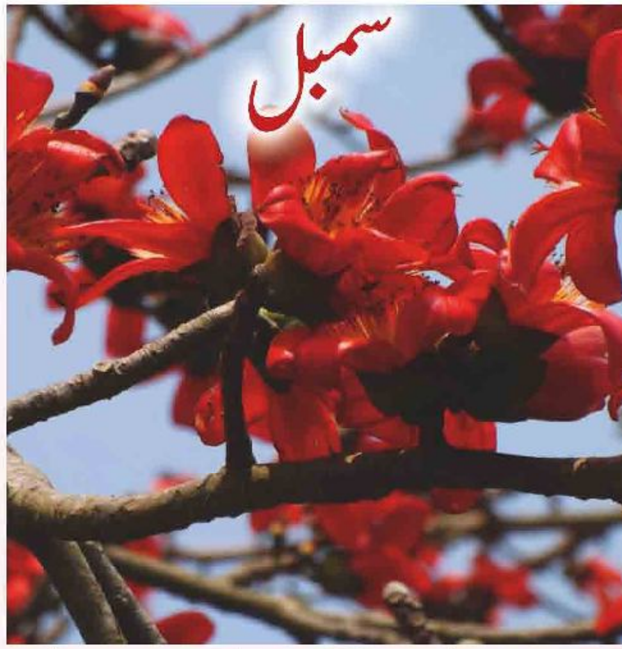

سمبل

یوں تو اس کائنات میں بے شمار پیڑ پودے دیکھنے کو ملتے ہیں اور اِس روئے زمین پر مست ہو کر لہلہاتے رہتے ہیں اور دعوتِ نظارہ بھی دیتے ہیں۔ یہ دعوتِ نظارہ ہر پیڑ پودے اپنی مختلف خصوصیات کی وجہ سے دیتے ہیں۔ انھیں خصوصیات کی بنا پر لوگ ان کی طرف متوجہ بھی ہوتے ہیں۔ حالانکہ کچھ پیڑ پودے نہ پھل کے اعتبار سے خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں اور نہ پھولوں کی وجہ سے— باوجود اس کے پھر بھی وہ پیڑ پودے انسانوں کی توجہ کا مرکز رہتے ہیں۔

آم، شیشم، چنار، سفیدہ، دیو دار، ساگوان، ارجن، اشوک، چیکو، ناشپاتی، سیب، آڑو، آلو بخارا، موسمی، سنترہ، شہتوت، آنولہ، بادام، امرود، اخروٹ وغیرہ— اور اسی طرح اگر ہم پودوں کی بات کریں تو اَن گنت پودے جن میں خودرَو بھی شامل ہیں، اپنی کسی نہ کسی خوبی کی وجہ سے انسان کو اپنی جانب متوجہ بھی کرتے ہیں اور جاذبِ نظر بھی لگتے ہیں۔

درختوں میں آم، پھلوں کا راجا تو ہے ہی مگر پودوں میں گلاب کو پھولوں کا بادشاہ کہا جاتا ہے۔ ویسے تو ہر پیڑ پودے کی اپنی اپنی خوبیاں اور خاصیتیں ہیں۔ کسی درخت کے پھل کھائے جاتے ہیں تو کسی کی لکڑی قیمتی ہوتی ہے۔ کچھ درخت دونوں نوعیت سے اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ یعنی پھل اور لکڑی — کچھ پودے بھی کئی اعتبار سے خصوصیت کے حامل ہوتے ہیں یعنی پھول، عطر، دوا— اور نہ جانے لوگ کن کن کاموں میں استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ان تمام پیڑ پودوں میں جو ہمیں روئے زمین پر کھڑے ہوئے، لہلہاتے ہوئے، اٹھلاتے ہوئے، جھومتے ہوئے، مچلتے ہوئے، رقص کرتے ہوئے، گرتے ہوئے اور سنبھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں، ان میں سمبل کے درخت کی

محمد مستمر

ڈاکٹر محمد مستمر کا تعلق ضلع مظفر نگر کے تاریخی قصبہ حسن پور لوہاری سے ہے۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم مقامی مدرسے سے حاصل کی۔ چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ سے ایم اے اور ایم فل کیا۔ دہلی یونیورسٹی سے 'اردو افسانوں میں نفسیاتی عناصر کی عکاسی' کے موضوع پر پی ایچ ڈی کی۔ تقریباً 13 برس تک ہریانہ اردو اکادمی کے شعبۂ اردو خط و کتابت کورس سے وابستگی رہی۔ ان دنوں ذاکر حسین دہلی کالج میں بہ حیثیت اسسٹنٹ پروفیسر تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ایک درجن سے زائد کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں جن میں آؤ اردو سیکھیں (قاعدہ) آؤ اردو سیکھیں (ورک بک) بچوں کے لیے ہیں۔

کچھ الگ ہی خاصیت ہے۔ سمبل مختلف ناموں جیسے سُمبلو، سملو، سیمل، ہملہ، ہمولو وغیرہ سے پکارا جاتا ہے اور اس کا سائنسی نام بامبیکس سئی با(Bombax Ceiba) ہے۔

دنیا میں کوئی بھی چیز بے کار نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہمیں اس کی اہمیت کے بارے میں علم نہ ہو۔ سمبل بھی بے پناہ طبی فوائد اپنے اندر جذب کیے ہوئے ہے۔ سمبل کا درخت سراپا نعمت ہے۔ جڑ، تنا، چھال، پتے اور لکڑی، سبھی کچھ بنی نوع انسان کے لیے کسی عطیے سے کم نہیں ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم اس کے طبی فوائد پر بات کریں، پہلے اس کی ساخت، بناوٹ، خوبصورتی، رنگ روپ اور شکل وصورت کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ سمبل کا درخت قد وقامت کے اعتبار سے سرو اور صنوبر کے درخت سے کم نہیں ہوتا— ہاں یہ الگ بات ہے کہ ہمارے شاعر حضرات اس کو معشوق کے قد سے تشبیہ نہیں دیتے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ اس کے جسم پر لمبے لمبے مگر فاصلوں سے کانٹے ہوتے ہیں جبکہ معشوق تو نازک اندام ہوتا ہے— ترکی بہ ترکی پھر گلاب کے پودے پر بھی تو کانٹے ہوتے ہیں، اس سے تو کوئی گریز نہیں—؟ اگر گلاب کے پھول کی نازکی اور خوبصورتی کی بات کریں، جس نازکی کا ذکر معشوق کے تعلق سے میر نے بھی کیا ہے تو سمبل کے پھول کی نازکی اور خوب صورتی کو بھی آپ نظر انداز نہیں کر سکتے۔ یہ الگ بات ہے کہ گلاب کا سکہ صدیوں سے رائج ہے۔ اگر خوشبو کی ہی بات کریں تو خوشبو تو گلاب کے ہر پھول میں بھی نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ گلاب کا پھول یقیناً ہر دل عزیز ہے اور یہ قریب قریب ہر خطے اور علاقے میں پایا جاتا ہے جبکہ سمبل اس قدرتی اعزاز سے محروم ہے۔ یہ زیادہ تر خشک تر علاقوں میں اگتا ہے۔ اسی لیے لوگ اس کے نام سے کم کم واقف ہیں اور اہمیت کی بات تو خیر چھوڑیے ہی— مارچ کے مہینے میں جب کائنات کے چپے چپے پر جشنِ بہاراں کی دستک ہوتی ہے تو اِس کے درخت پر سبز کاہی گچھوں کی شکل میں کلیاں جو سردی کی وجہ سے کچھ کالی بھی پڑ جاتی ہیں، ہو بہ ہو لٹو جیسی ہوتی ہیں، آہستہ آہستہ چٹکنی شروع ہوتی ہیں اور مارچ تک مکمل پھول کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ پھول کیا ہوتا ہے—! واللہ— دہکتا ہوا انگارا ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے رباعی، غزل اور مثنوی دلہن کا سرخ جوڑا پہن کر، گھونگھٹ نکال کر قصیدے (سمبل) سے بیاہ رچانے کے لیے بہ ضد ہوں اور قصیدہ مخمصے میں ہو کہ شادی آخر کروں تو کس سے کروں—؟ یہ جوبن، یہ شباب، یہ نور، سمبل پر کم وبیش ایک مہینے تک قائم رہتا ہے— گچھوں کی شکل میں، پھر یہ کلیاں جو انگارے کی طرح دہکتی رہتی ہیں، انگارے کی طرح ہی بجھ کر بے نور ہو جاتی ہیں اور پھل کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس کا پھل کیپسول جیسا ہوتا ہے جسے ڈوڈا بھی کہتے ہیں جو پکنے پر سفید رنگ کے ریشوں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ ریشے کچھ کچھ کپاس سے ملتے جلتے ہیں۔ پھل پھٹنے پر ریشے ہوا کے دوش پر بادلوں کی طرح مست ہو کر تیرتے رہتے ہیں۔ یہ ریشے چمکیلے اور نہایت ہی ملائم ہوتے ہیں جنھیں روئی کی طرح دُھننے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ اس کی روئی تکیوں، کوشن، گدوں وغیرہ کے کام میں لائی جاتی ہے۔

سمبل کا درخت جب چھوٹا ہوتا ہے تو ایک چھوٹے نادان اور نٹ کھٹ بچے کی طرح تھوڑا بہت جھوم لیتا ہے، ناچ لیتا ہے اور مچل لیتا ہے— مگر جیسے جیسے یہ بڑا ہوتا جاتا ہے تو یہ اپنی شوخیوں کو بھول کر 'انا' کے خول میں داخل ہو جاتا ہے— اس کی 'انا' تنے سے لے کر شاخوں تک میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ہزار طوفان اور آندھیاں آئیں— تیز ہوائیں چلیں مگر یہ ٹس سے مس نہیں ہوتا، ٹوٹ سکتا ہے مگر جھک اور

لچک نہیں سکتا۔ آسمان سے باتیں کرتا ہوا، ساگوان، چنار، دیودار، شال، سرو، صنوبر، پاپولر اور سفیدے سے آنکھیں ملاتا ہوا نظر آتا ہے۔ سیدھا، سچا اور توانا پہاڑ کی طرح کھڑا رہتا ہے۔ اس پر پتے اور شاخیں کم تعداد میں ہوتی ہیں۔ چنانچہ دھوپ یا بارش سے بچنے کے لیے آپ اس کی پناہ نہیں لے سکتے۔

سمبل کی جڑ جسے سمبل موسلی بھی کہتے ہیں، بہت کارآمد ہوتی ہے۔ جب سمبل عہدِ طفلی میں قریب ڈیڑھ دو میٹر اونچا ہوتا ہے، اس کو جڑ سے اکھاڑ لیا جاتا ہے۔ جڑ کو چھیل کر چھلکا سائے میں سکھا لیا جاتا ہے۔ چھلکے اور جڑ کا رنگ ہلکا پیلا ہوتا ہے اور جڑ ذائقے میں تلخ ہوتی ہے۔ اس کی جڑ انسانی اعصابی نظام کو طاقت دیتی ہے اور چھلکا کینسر جیسے مہلک مرض میں نہایت مفید ہے۔ جن طبیبوں نے اس کو سرطان کے مرض میں استعمال کیا ہے، سرطان جڑ سے ختم ہو گیا۔ خواہ سرطان بدن کے کسی بھی اعضا میں کیوں نہ ہو۔ یہ صرف کینسر کے مرض میں ہی مفید نہیں بلکہ سمبل کے بے شمار طبی فائدے ہیں۔ مثلاً: یہ دماغی رسولی (برین ٹیومر) میں کام کرتا ہے۔ اس کے علاوہ سمبل موسلی کا سفوف بنا کر، دودھ کے ساتھ کھانے سے ناسور کے پھوڑے میں بھی فائدہ ہوتا ہے۔ سمبل کا چھلکا منہ کے چھالوں، دانت کے درد، پسلیوں کے درد وغیرہ میں بھی اچوک دوا کا کام کرتا ہے۔ اسی کے ساتھ پرانے زخموں پر سفوف چھڑکنے سے زخم لگ بھگ ہفتے بھر کے اندر بھر جاتا ہے۔ سمبل کے درخت کے اس قدر فائدے ہیں کہ طِب کے تعلق سے بہت کچھ روشنی ڈالی جاسکتی ہے۔

سمبل کی کلی کا کھانے میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ سمبل کی کلی جب تک چٹکتی نہیں یعنی پھول نہیں بنتی تو اِسے کھانے کے کام میں لایا جاتا ہے۔ کلی کا سینہ چاک کر کے اس کے اندر سے پھول بننے والی پتیوں کو نکال دیا جاتا ہے۔ آلو کی خوبی یہ ہے کہ یہ غریب و امیر سب کے دکھ سکھ کا ساتھی ہے، جو سبزی خور ہوتے ہیں وہ اس کی کلی کو آلو کے ساتھ اور جو گوشت خور ہوتے ہیں وہ قیمے کے ساتھ پکاتے ہیں۔ بہت ہی لذیذ ڈِش تیار ہوتی ہے۔ سب سے خاص بات یہ کہ ڈش کی ڈش اور غذا کی غذا— پکنے کے بعد یہ ڈش بہت لعاب دار ہو جاتی ہے جو ہمارے گھٹنوں اور جوڑوں کے درد کو دور کرتی ہے اور ساتھ ہی روغن بھی پیدا کرتی ہے— سونے پر سہاگا یہ کہ سبزی کی سبزی اور دوا کی دوا—

سمبل کے درخت کے جہاں اتنے فائدے ہیں تو وہیں یہ حسن کو نکھارنے میں بھی اہم کردار ادا کرتا ہے۔ نوجوانی کی عمر میں جب چہرے پر کیل مہانسے، جھائیاں اور داغ دھبے پڑ جاتے ہیں تو اس کے پتوں کا پیسٹ بنا کر یا جڑ کو پیس کر سرسوں کے تیل میں ملا کر لگانے سے ان تمام مسائل سے نجات ملتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سمبل درحقیقت بنی آدم کے لیے ایک نعمت ہے۔

لیکن یہ بات یاد رہے کہ اگر سمبل کے جوبن، شباب، بہار اور نورانی کیفیت کو دیکھنا ہو تو آپ کو پورے ایک سال نرگس کی بہار کی طرح، منتظر رہنا پڑے گا کہ کیسے رباعی، غزل اور مثنوی قصیدے سے بیاہ رچانے کے لیے بے تاب رہتی ہے اور قصیدہ مخمصے میں پڑ جاتا ہے۔ آخر میں سمبل کے جوبن اور بہار کے تعلق سے بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ پورے سال سمبل بھی اپنی بے نوری پر روتا رہتا ہے اور 'انا' کے زعم میں خزاں رسیدہ کھڑا رہتا ہے۔

■

Dr. Mohd Mustamir
Asst. Prof. Zakir Husain Delhi College
Delhi University
Delhi - 110002

مضمون

غضنفر اقبال

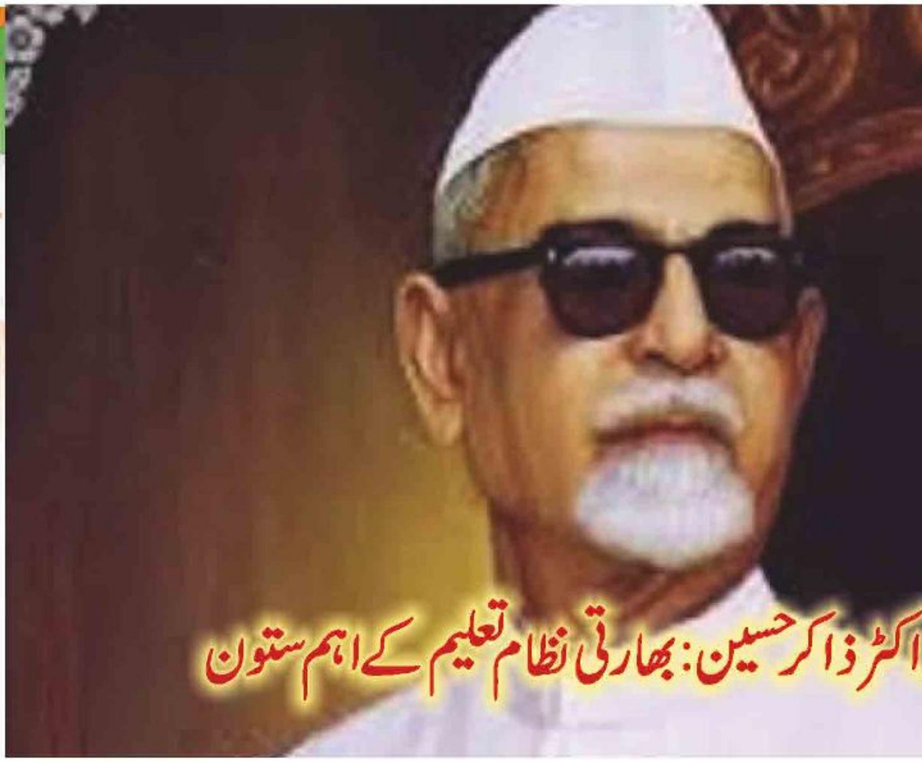

ڈاکٹر ذاکر حسین: بھارتی نظام تعلیم کے اہم ستون

بچو! آج آپ کے سامنے بھارت کی ایک محترم شخصیت ڈاکٹر ذاکر حسین جلوہ افروز ہیں۔ میں ان سے آپ کی ملاقات کرواتا ہوں۔ وہ ایک شفیق استاد تھے اور کہا کرتے تھے ''اُستاد کی کتابِ زندگی کے سرورق پر 'علم' نہیں لکھا ہوتا ہے۔ 'محبت' کا عنوان ہوتا ہے۔ اسے انسانوں سے محبت ہوتی ہے۔ سماج جن خوبیوں کا حامل ہے، ان سے محبت ہوتی ہے۔ ان ننھی ننھی جانوں سے محبت ہوتی ہے، جو آگے چل کر ان خوبیوں کی حامل بننے والی ہوتی ہیں۔ ان میں جہاں تک اور جس اسلوب سے ان خوبیوں کی تکمیل کا سامان ہے، یہ اس میں مدد دیتا ہے۔ اسی کام میں اپنے دل کے لیے راحت اور اپنی روح کے لیے تسکین پاتا ہے۔''

ڈاکٹر ذاکر حسین کے اجداد آفریدی پٹھان تھے۔ ان کا آبائی وطن قائم گنج ضلع فرخ آباد تھا۔ ان کے والد فدا حسین خان نے تجارت کے لیے حیدرآباد دکن کا رخ کیا۔ حیدرآباد میں انھوں نے مرادآبادی برتنوں کا کام شروع کیا لیکن حصول تعلیم کا شوق دل میں پیدا ہوا تو پڑھنے لکھنے میں مصروف ہوئے اور قانون کا امتحان پاس کر کے اورنگ آباد دکن میں وکالت کا آغاز کیا۔ پڑھے لکھے آدمی تھے۔ اسی لیے انھوں نے 'آئین دکن' کے نام سے ایک رسالہ جاری کیا۔ وکالت اور صحافت سے سارے دکن میں فدا حسین خاں نے شہرت حاصل کی۔ وہ اورنگ آباد سے حیدرآباد آ گئے، جہاں تجارت کا آغاز کیا تھا وہیں دفتر بنالیا اور پھر اسی جگہ زمین لے کر گھر کی تعمیر کروائی۔ اسی گھر میں وکالت خانہ، کتب خانہ اور اخبار کے دفتر کو منتقل کر دیا۔ فدا حسین خاں کی شادی نبی داد خاں کی لڑکی نازنین بیگم سے ہوئی تھی۔ ان کے سات لڑکے تھے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، فدا حسین خاں کے تیسرے فرزند تھے۔ ذاکر حسین کی پیدائش 8/فروری 1897 کو حیدرآباد دکن میں ہوئی۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ وہ گھر پر ہی انگریز ٹیوٹر کے

ذریعے پڑھے۔ والد کی رحلت کے بعد قائم گنج آئے تو انھیں مولوی بشیر الدین کے قائم کردہ اٹاوے کے اسلامیہ ہائی اسکول میں داخل کروایا گیا۔ اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ذاکر حسین نے ایم اے او، کالج علی گڑھ میں داخلہ لیا۔ بی اے کی کامیابی کے بعد انھوں نے ایم اے (معاشیات) سے کیا۔ معاشیات کی اعلیٰ تعلیم کے لیے ذاکر حسین جرمنی گئے۔ وہاں تین برس قیام رہا اور وہیں سے معاشیات میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

ذاکر حسین نے شاہ جہاں بیگم سے نکاح کیا۔ ان کی تین لڑکیاں تھیں۔ قائم گنج میں طاعون کی وبا پھیلی تھی جس میں کئی گھر ویران ہوئے۔ اسی وبا میں ذاکر حسین کی والدہ کا انتقال ہوا۔ والدہ نے نہایت گہرے نقوش ذاکر حسین پر چھوڑے تھے اور ان کی صحبتوں سے فیض حاصل کرنے کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔

ذاکر حسین نہ صرف ایک ہونہار طالب علم تھے بلکہ وہ اپنے اساتذہ اور طالب علموں دونوں میں ہر دل عزیز بھی تھے۔ ان کی ہر دل عزیزی کا ایک واقعہ ان کے ساتھی طلبہ اور اُس زمانے کے اساتذہ بیان کرتے تھے۔ ہوا یوں کہ ایک مرتبہ ہاسٹل کے کچھ لڑکوں نے یہ مطالبہ کیا کہ ''پلیٹ بند کرنے کی سزا'' موقوف کی جائے۔ اور اس بات پر احتجاج بھی کر دیا۔ ان دنوں ہاسٹل کے قواعد میں یہ بھی تھا کہ سزا کے طور پر کسی طالب علم کے کھانے سے ایک پلیٹ کم کر دی جاتی تھی گویا اسے دوسروں کے مقابلے میں ایک پلیٹ سالن کم ملتا تھا۔ اس احتجاج کی پشت پناہی ذاکر حسین نے کی۔ حالاں کہ ظاہراً وہ احتجاج میں شریک نہیں تھے۔ جب یہ احتجاج باوجود کوشش کے ختم نہ ہوا تو صدر مدرس سے شکایت کی گئی اور احتجاج کرنے والے لڑکوں کو اسکول سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا۔ جب ذاکر حسین کو علم ہوا تو انھوں نے وارڈن کے یہاں جا کر اصرار کیا کہ یہ حکم ناجائز ہے اسے واپس لیا جائے۔ ان کا کہنا تھا کہ طالب علم کی سزا میں پلیٹ بند کرنے کا طریقہ نہ صرف ظلم ہے بلکہ غیر اخلاقی بھی ہے۔ جب یہ لوگ کھانے کا پورا پیسہ دیتے ہیں تو ان کی پلیٹ کیوں بند کی جائے۔ آخر کار ان کی سفارش اور زور دینے پر وارڈن اور صدر مدرس کو اپنا حکم واپس لینا پڑا اور پلیٹ بند کرنے کا طریقہ بھی ہمیشہ کے لیے بند کر دینا پڑا۔

ذاکر حسین میں انسانی ہمدردی اور شرافت اسکول کے زمانے سے ہی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ روزانہ ہاسٹل سے اٹاوہ اسٹیشن جو قریب ایک کلو میٹر تھا، ذاکر حسین صرف اخبار خریدنے جایا کرتے تھے جب وہ اخبار لے کر واپس آتے تو بہت سے طالب علم ان کے چاروں طرف اکٹھا ہو جایا کرتے اور وہ سب کو اخبار پڑھ کر سنایا کرتے تھے اور اکثر خبروں پر تبصرہ بھی کرتے جاتے تھے۔ ان باتوں سے بھی وہ اپنے ساتھیوں میں ہر دل عزیز تھے۔ ان کے ساتھی ذاکر حسین کو مرشد کے نام سے پکارتے تھے۔

ذاکر حسین صحیح معنوں میں ایک مدرس تھے۔ وہ خوب جانتے تھے کہ حکم دے کر کام کروانے سے بچوں پر الٹا اثر پڑنے کے زیادہ امکانات ہوتے ہیں۔ چناں چہ اپنی بات منوانے کے لیے انھوں نے کبھی 'حکم' کا استعمال نہیں کیا۔ وہ بچوں کی بری عادتوں کو بڑے نرالے اور نفسیاتی ڈھنگ سے دور کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ ان کے نزدیک تعلیم کے تین درجے تھے۔ پہلا معلومات کا ذخیرہ اکٹھا کرنا، دوسرا ان معلومات کا جوہر اخذ کرنا اور تیسرا اس جوہر سے اخلاقی شخصیت کی تعمیر کرنا۔ اگر یہ تینوں عمل ظہور میں آئے ہوں تو انسان تعلیم یافتہ کہلایا ئے گا۔

ذاکر حسین کہا کرتے تھے کہ اچھی کتاب ہماری زندگی کو سدھارنے میں بڑا اچھا رول ادا کرسکتی ہے۔ وہ نہ صرف تنہائی کی ایک بہترین ساتھی ہے بلکہ تفریح کا ایک اچھا وسیلہ بھی ہے۔ بچوں کو غیر شعوری طور پر اچھی اور مفید باتیں سکھانے کا ایک عمدہ طریقہ ہے۔ اسی لیے انھوں نے بچوں کے لیے کہانیاں اور ڈرامے لکھے۔ انھوں نے کہانیوں میں سچائی، ایمان داری، خلوص اور دوستی کو اُبھارا ہے۔ ان کی کئی بچوں کے لیے لکھی ہوئی کئی کہانیاں مشہور ہوئیں۔ مگر ایک کہانی 'ابو خاں کی بکری' بہت مقبول ہوئی۔ اس کہانی میں غلام بھارت کی عکاسی کی گئی ہے۔ اس کہانی کو انھوں نے استعاراتی انداز میں لکھا ہے۔ اس کا اسلوب اور زبان وبیان بھی لاجواب ہے۔ ذاکر حسین سچے محبِّ وطن تھے۔ اسی لیے انھوں نے اس کہانی میں آزادی کی لگن اور اُس کا حصول ایک بکری کے توسط سے دکھایا ہے۔ یہ کہانی، ذاکر حسین نے تحریک آزادی کے دوران بچوں کے لیے لکھی تھی۔ اس لیے اس میں آزادی کی خواہش اور لگن پر زور دیا گیا تھا۔

ذاکر حسین نے دہلی میں یتیم بچوں کی نگہداشت کے لیے ایک یتیم خانے کی بھی بنیاد ڈالی تھی۔ اس کا نام 'بچوں کا گھر' رکھا تھا۔ وہ بچوں کے لیے دل وجان سے کام کرتے رہے۔ ایسی بے غرض اور بے لوث خدمت اور ایثار بہت کم لوگ کرسکتے ہیں۔

ذاکر حسین نے افلاطون کی مشہور کتاب Republic کا اُردو ترجمہ ریاست کے نام سے شاندار، سلیس اور دل کش اُردو میں کیا تھا۔ علی گڑھ کالج کے ماہانہ رسالے 'علی گڑھ' میں زپ کے فرضی نام سے مضامین لکھتے تھے۔ مباحثوں میں پیش پیش رہتے۔ یہی وجہ ہے کہ تقریر کے فن میں ان کا لوہا سب مانتے تھے۔

ذاکر حسین نے بھارت کی آزادی کے لیے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا بلکہ نمایاں کردار ادا کیا۔ زمانہ طالب علمی سے ہی وہ تحریک خلافت اور تحریک ترک موالات سے متاثر تھے۔ وہ گاندھی جی کے تعلیمی نظریات کے بھی حامی تھے۔ 1937 میں مہاتما گاندھی نے ان کو نیشنل کمیٹی آف بیسک ایجوکیشن (بنیادی تعلیم کی نیشنل کمیٹی) کی صدارت کے لیے منتخب کیا تھا، جس نے نئی اسکیم کا تعلیمی خاکہ تیار کیا اور 1938 میں ہندوستانی تعلیمی سنگھ کا منصب صدارت سنبھال کر انھوں نے ملک کے تعلیمی نظام کو ایک بالکل نئی سمت عطا کی۔ وہ یونیورسٹی ایجوکیشن کمیشن، انڈین پریس کمیشن، یونیورسٹی گرانڈس کمیشن، یونیسکو انٹرنیشنل اسٹوڈنٹ سروس اور ایجوکیشن سنٹرل بورڈ آف سکنڈری سے وابستہ رہے۔

ڈاکٹر ذاکر حسین، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے وائس چانسلر کے علاوہ ریاست بہار کے گورنر اور بھارت کے نائب صدر، صدر جمہوریہ جیسے پروقار عہدے پر بھی فائز رہے۔ صدر جمہوریہ ہونے کے باوجود ان میں انسان دوستی کے ساتھ بلند اخلاق اور اعلیٰ شرافت بھی تھی۔ وہ اپنے چھوٹوں سے جس محبت اور شفقت سے ملتے تھے اس کی مثال بھی بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔ جب بھی ان کے چھوٹے ان سے ملنے جاتے تو وہ انھیں رخصت کرنے کے لیے کمرے سے باہر تشریف لاتے تھے۔

خلوص، ایثار، محبت، ہمدردی اور شائستگی کا پیکر ڈاکٹر ذاکر حسین 3 / مئی 1969 کو دہلی میں خدا کو پیارے ہوگئے۔

{تعارف اپریل 2022 کے شمارے میں شائع ہوچکا ھے}

■

Dr. Ghazanfar Iqbal
"SAIBAN" Zubair Colony,
Hagarga Cross, Ring Road,
Gulbarga-585104 (Karnataka)
Mob.: 09945015964
Email: ghazanfaronnet@gmail.com

بانس (Bamboo)

(ماحولیاتی نظام کی بقا و تحفظ کا ضامن)

نسیم سعید

بانس لاکھوں غریب خاندانوں کے گزر بسر کا ذریعہ ہے۔ اس کے طفیل روزگار پانے والوں میں کروڑوں کاشتکار، غریب مزدور، پچھڑے، دلت اور آدیواسی سماج کے لوگ شامل ہیں۔ مہاراشٹر کا بروڈ (Burud) سماج خاص طور سے قابل ذکر ہے۔

بانس سے کئی چیزیں بنائی جاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے یہ ایک اہم خام شے ہے۔ اس کے روز بروز استعمال کے اضافے کے سبب اسے چھوٹا ٹمبر (Small timber) بھی کہا جاتا ہے۔ کیوں کہ اس کا استعمال عمارت سازی یا مسکن سازی میں بہت ہوتا ہے۔ یہ جنگلاتی دولت ہونے کے ساتھ ہی آمدنی کا بہترین وسیلہ بھی ہے۔ کاغذ سازی کی صنعت کو اس کی بدولت خوب فروغ حاصل ہوا ہے۔ اس کی وجہ سے کسانوں کو خوب مالا مال ہونے کا موقع فراہم ہوا ہے۔

بانس کی کُل 136 انواع واقسام ہیں۔ ہندوستان میں مہاراشٹر، مدھیہ پردیش، چھتیس گڑھ، اڑیسہ اور آسام میں اس کے سب سے زیادہ جنگلات پائے جاتے ہیں۔ آج ملک میں اس سے کئی طرح کی اشیا بنانے کی اکائیاں شروع ہیں۔ بانس سے مکانوں کی دیوار، چھت، باڑ، گھروں کے اندر سجاوٹ کے سازوسامان، فرنیچر، زیورات اور بانس وڈ (Bamboo Wood) وغیرہ تیار کیے جاتے ہیں۔ جدید طرز زندگی میں بانس کے فرنیچر اور زیورات کے چلن میں اضافہ ہوا ہے۔ لوہے کی سلاخوں کی طرز پر بانس کی چھڑیں بھی بنائی جاتی ہیں۔ یہ لوہے کی سلاخوں کی بہ نسبت کافی ارزاں ہوتی ہیں۔ بانس سے بنی اشیا کے بڑھتے استعمال اور اچھے منافع کے سبب بیوپاریوں کی دلچسپی اور رجحان اس طرف بڑھا ہے۔ حکومتی مراعات، منصوبوں اور اسکیموں کے زمرے میں آنے کی وجہ سے یہ چھوٹی صنعت میں شامل ہوگیا ہے۔

خوردنی اشیا کی صورت میں بھی بانس کا استعمال ہوتا ہے۔ دراصل ساٹھ سال پرانے بانس میں بیج آنے لگتے ہیں۔

ادیواسی اور دوسرے پچھڑے طبقوں میں اس بیج کی روٹیاں بنانا عام بات ہے۔ بانس کے ملائم، نرم اور سبز تنوں سے سبزی، اچار اور مربہ بھی بنایا جاتا ہے جو کہ صحت بخش غذاؤں میں شمار ہوتا ہے۔ دواسازی کی صنعت میں خاص طور سے آیورویدی دواؤں کی تیاری میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس سے تیار شدہ اشیا کا استعمال گرمیوں میں راحت فراہم کرنے کے لیے ہوتا ہے۔ بانس کا استعمال آرائشی و زیبائشی مصنوعات کی تیاری میں بھی ہوتا ہے۔ آج کے دور میں کولر اور اے سی (A.C.) کا یہ ایک اچھا قدرتی متبادل بھی ہے۔ ہمارے ملک میں انگریزوں نے اپنے دورِ حکومت میں بانس سے گھریلو اشیا تیار کرنے والوں کو 'بسوڑ بہی' عطا کی تھی۔ یہ جنگل سے اپنی ضرورت کے مطابق بانس لانے کا اجازت نامہ (Permit) تھا۔ ملک میں انگریزی حکومت کے خاتمے اور جمہوری نظام کے قیام کی بحالی تو ہوئی مگر اب بھی بسوڑ بہی پر عمل کی روایت قائم ہے۔ آج بھی اس کی بنیاد پر ہی جنگل ڈپو سے بانس فراہم کیا جاتا ہے۔ حالانکہ کم شرح پر یہ فراہم ہو جاتا ہے۔ مگر آج بھی روزگار کے متلاشی اس بہی یا اجازت نامہ کو حاصل کرنے کے لیے قطار بند ہیں۔

بانس بنجر زمین پر بھی آسانی سے اُگ جاتا ہے۔ اس کی کئی انواع و اقسام ہونے کے سبب حسبِ ضرورت سادہ بانس، کٹانگ بانس، سبز و لچیلا بانس وغیرہ کی کاشت مفت میں کی جاسکتی ہے۔ سنتروں و دیگر پھلوں کے باغیچوں کی حفاظت میں اس کا استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر فصلوں کی حفاظت کے ساتھ ہی زمین کی جھیج اور نمی کو بھی روکنے کا یہ ایک اچھا ذریعہ ہے۔

بانس کو کاٹنے سے لے کر فروخت کرنے تک کے لیے محکمہ جنگلات کی اجازت لینے کے سبب کسان اس کی کاشتکاری کو تقریباً چھوڑ چکے تھے۔ مگر اب اسے گھاس جماعت میں شامل درجہ ملنے کے سبب اس کی پیداوار کی طرف کسان متوجہ ہو رہے ہیں۔ وہ کھیتوں کے کنارے پر لگانے کے ساتھ ہی بنجر زمین کا بھی استعمال اس کی پیداوار کے لیے کر رہے ہیں۔ لیکن چاول کے کھیتوں کے کنارے اتنے مضبوط نہیں ہوتے کہ اُس پر بانس لگایا جاسکے۔

مہاراشٹر کا بروڈ سماج خاص طور سے اس گھریلو پیشے سے منسلک ہے۔ بروڈ سنسکرت لفظ ہے جس کے معنیٰ 'چٹائی سازیا باسکٹ بنانے والے' کے ہوتے ہیں۔ اس سماج کا یہ آبائی اور روایتی پیشہ ہے۔ یہ بانس سے بنی اشیا کی دستکاری (Bamboo Craft) کے لیے مشہور ہیں۔ ان کا گزر بسر اس پیشے پر منحصر ہے۔ چٹائی، باسکٹ و دیگر گھریلو استعمال کی کارآمد اشیا تیار کرنا ان کا ہنر بھی ہے اور پیشہ بھی۔ اس کے لیے یہ سماج اپنی بانس کی کاشتکاری یا جنگلات کے ڈپو پر منحصر رہتے ہے۔ مہاراشٹر کے زرخیز اور معدنیات سے لبریز علاقہ ودربھ کے گڑھ چرولی، گوندیا، چندرپور، ناگپور، ایوت محل، وردھا، بھنڈارہ اور امراوتی ضلعوں میں یہ سماج کافی بڑی تعداد میں آباد ہے۔ یہ بانس سے بنی اشیا کی دستکاری کے لیے عمدہ درجے کے بانس کا سدا خواہشمند رہتا ہے۔ کم گولائی والا یا کم نصف قطر کا بانس دستکاری کے لیے زیادہ موزوں نہیں ہوتا۔ بھنڈارہ کے صنعتی علاقے دہے گاؤں میں انسٹی ٹیوٹ آف ویلیج انٹر پرائزز ڈیولپ منٹ فار ہینڈی کرافٹ آرٹی جن (ویگھا) Institute of village Interprises Development for Handicraft Artigen (Vegha) بانس سے بنی کارآمد اور مفید اشیا کی تیاری کے لیے مشہور ہے۔ بھارت میں ایسی صنعتوں و تنظیموں اور کرافٹ پر مبنی اداروں کو مزید فروغ دینے کی ضرورت ہے۔ آج یوروپ و امریکہ جیسے براعظم

بانس کے فوائد وضروریات سے مکمل واقفیت حاصل کر کے اپنی جدید تہذیب وتمدن کو فروغ دینے کے ساتھ ہی ماحولیاتی نظام کی بقا و تحفظ کے لیے اُٹھائے گئے ضروری اقدامات میں اسے اولیت دے کر اپنی دانشمندی و ہوشمندی کا ثبوت فراہم کیے ہیں۔ بانس سے تیار شدہ فرنیچر میں ایک خاص قسم کا پلائی (Ply) استعمال کیا جاتا ہے۔ جسے Bamboomate board کہا جاتا ہے۔اس کے علاوہ بانس کا استعمال ٹیبل ٹاپ، صوفہ سیٹ، کرسیوں کے ساتھ ساتھ کمروں اور بڑے ہال کی سجاوٹ میں بھی کیا جاتا ہے۔

آج ڈیجیٹل کارکردگی کا دور دورہ ہے۔ ہر طرف ڈیجیٹل آلات کا استعمال ہونا عام بات ہوگئی ہے۔تکنیک کے لحاظ سے جدید ترین سہولیات سے لیس زمانہ آج کافی عروج پر پہنچ گیا ہے۔اس کے باوجود زمانے کی خوشنمائی اور دلفریبی کے مناظر میں قدرتی اور روایتی اشیا کے اپنے جلولے آج بھی ہر سمت نظر آتے ہیں۔ان قدرتی اور روایتی طرزِ معاشرت کو نظر انداز کر کے ہم زمانے کی تیز رفتار زندگی کے ساتھ قدم تال تو کر سکتے ہیں لیکن دل و دماغ آج بھی ہمیں فطری و قدرتی اشیا کے حسن ولطافت کے زیر سایہ جینے کے لیے مجبور کرتا ہے۔کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم قدیم و جدید طرز معاشرت کے امتزاج کو زندگی کا مستقل حصہ ہی بنا لیتے۔فی الحال ایسے مناظر دیکھنے کو بھی ملتے ہیں۔کسی نے سچ کہا ہے کہ 'جہاں قدرت کے نظارے موجود ہیں وہیں چاہت کے جذبات اپنے پیر پسارتے ہیں اور جہاں چاہت ہے وہاں سکون و اطمینان کا بسیرہ ہوتا ہے جو کہ انسانوں کے لیے تسکین کی علامت ہے۔' دلی امن وامان، بےفکری، فارغ البالی، صحت بخش اور اطمینان بخش خیالات وتصورات کے ضامن ہوتے ہیں۔

ہم اپنے بچپن میں بانس کے بنے مختلف کھلونوں سے لطف اندوز ہوئے ہیں۔بیل گاڑیوں، گل دستوں، پنکھوں، چٹائیوں، بیت سے بنی ہوئی کرسیوں وصوفوں اور انواع و اقسام کے گھریلو استعمال کردہ برتنوں کو بانس کی قمچیوں سے بنتے اور بکھرتے دیکھا ہے۔ بانس کی نرم ونازک گیلی قمچیوں کو تراش خراش کر ہم نے مختلف گھریلو اشیا کو استعمال کرتے ہوئے اپنا بچپن گزارا ہے۔ان اشیا کو مختلف رنگوں میں ڈبوتے دیکھ کر دلکش و پر سکون مناظر سے بھی محظوظ ہوئے ہیں۔ سجاوٹ و بناوٹ کے لحاظ سے اپنی مثال آپ ہوا کرتے تھے ایسے برتن اور گھریلو نمائشی اشیا۔سلام ہے ایسے کاریگروں اور ہنرمند افراد کو جن کی دستکاری کے آگے جدید ترین زمانے کے گزٹس بھی ماند نظر آتے ہیں۔ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی بہترین مثال ہے ایسی دستکاری اور فنکاری۔حالاتِ حاضرہ کی دوڑتی بھاگتی زندگیوں میں اگر کہیں بھی تھوڑی بہت ان اشیا کی جھلک نظر آتی ہے تو مضطرب و بے چین انسان کے دل و دماغ کو ایک لمحے کے لیے سکون بھرا احساس ضرور میسر ہوتا ہے۔

بچوں میں موجود پوشیدہ تخلیقی صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے لیے اسکولوں میں بھی 'کام کرنے کا تجربہ (Work Experience) نامی مضمون شاملِ نصاب کرنے کا بھی مقصد یہی ہے۔مگر اس طرف لاپرواہی برت کر ہم اپنے نونہالوں کے ساتھ ناانصافی ہی کرتے ہیں۔ بانس سے بنی کارآمد اشیا کی تخلیق کاری کر کے ہم بچوں کے ذہنوں کی خوب اچھی طرح نشوونما کر سکتے ہیں۔ بچے ایسے عملی کاموں میں خوب دلچسپی لیتے ہیں اور عملی کارکردگی کا مظاہرہ بھی کرتے ہیں۔

22 نومبر 2017 کو ہندوستانی محکمہ جنگلات کے قانون میں ترمیم کر کے غیر جنگلاتی علاقوں میں اُگائے گئے بانس کو

درخت کی تعریف کے دائرے سے باہر رکھا گیا ہے۔اس کا مقصد کاشتکار کو بانس کی کٹائی پر اجازت نامہ لینے کی ضرورت سے آزاد کرنا ہے۔اس طرح بانس اب گھاس کی جماعت کے تحت آتا ہے، جب کہ اسے ہندوستانی جنگل کے قانون 1927 میں ایک درخت کی شکل میں تسلیم کیا جاتا تھا۔

سال 2009 سے عالمی سطح پر بانس کے بارے میں آگاہی کو فروغ دینے کے لیے ہر سال 18 ستمبر کو 'عالمی یوم بانس' منانے کے لیے پُر زور حمایت و تائید کی جا رہی ہے۔ بانس سے تیار شدہ نئی مصنوعات کی تیاری میں نئی تکنیک کا بھرپور استعمال کر کے اُسے زیادہ معاصر بنانے کی جدوجہد آج وقت کی اہم ضرورت ہے۔

دراصل بانس دُنیا کے وجود سے ہی انسانی زندگیوں میں روزانہ استعمال کا ایک اہم عنصر رہا ہے۔لیکن اس کے مناسب استعمال کی بجائے انسانی سرگرمیوں کی بے جا مداخلت کے سبب استحصال کی صورت کا وہ زیادہ شکار رہا ہے۔آج بانس کے مناسب و صحیح استعمال پر مبنی متعدد عالمی تنظیموں کا مقصد یہی ہے کہ بانس کی صلاحیتوں کو زیادہ اچھے طریقے سے استعمال کر کے اُسے عوامی نمائش و ضروریات کا عمدہ و مناسب موضوع بنایا جائے۔ قدرتی وسائل اور ماحولیاتی نظام کی بقا و تحفظ کے لیے بانس کی جدید کاشت کے طرز کو فروغ دینا وقت کا اہم تقاضا ہے۔اُس کے پائیدار استعمال کو یقینی بنا کر دُنیا بھر کے مختلف خطوں میں جدید صنعتوں کو فروغ دے کر سماجی و اقتصادی خوشحالی اور معاشی ترقی کو فروغ دیا جاسکتا ہے۔

ایک اندازے کے مطابق دنیا بھر میں دو ارب ہیکٹر سے زیادہ زمینیں جنگلات کی کٹائی اور تنزلی کا شکار ہیں۔ایسی زمینوں کی صحیح پرورش و نگہداشت کے لیے اس پر بانس کی کاشت کے ذریعے انسانی سرگرمیوں کی بےجا مداخلت کو ترجیح دی جاسکتی ہے۔ جوکہ ہمارے سیارے زمین کی صحت کی بنیاد ضرورت ہے۔ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ انواع و اقسام کی آلودگیوں کی وجہ سے ماحولی نظام میں خلل پیدا ہوگیا ہے۔ انواع و اقسام کے حیوانات و نباتات کا اس سیارے سے معدوم ہونے کے سلسلے کا آغاز ہوگیا ہے۔تاہم ایسی زمینوں پر بانس کی کاشت سے ماحولیاتی فعالیت کو ازسرنو بحال کیا جاسکتا ہے۔معاشرے کی ضروریات میں تبدیلی کے طور پر جنگل کے ماحولیاتی نظام کی اشیاء اور خدمات کی اصلاح پر غور کیا جاسکتا ہے۔ایسے نئے چیلنج سے نمٹنے میں بانس کا زبردست کردار ہوتا ہے۔

بانس لچکدار اور قابلِ تطبیق ہے۔اس کی نوع دم توڑتی زمین کو بحالی کرسکتی ہے۔ تیزی سے بڑھنے والی انوکھی خصوصیت کی بنا پر وسیع جڑ کے نظام اور زمین کی جھیج و کٹاؤ کو بھی یہ کم کرسکتا ہے۔ یہ ڈھلوانوں کو مستحکم کرسکتا ہے اور بھاری دھاتوں کو بھی جذب کرنے کی صلاحیت اس میں بدرجہ اتم موجود ہے۔سایے دار ماحول کی فراہمی کے ساتھ ہی جنگلی حیات کو بھی بحسن خوبی محفوظ رکھ سکتا ہے۔صاف وستھری فضا کو فراہم کرنے میں اس کا اہم کردار ہوتا ہے۔بشمول دیہی ترقی اور زرعی جنگلات کی مصنوعات کے یہ کئی سماجی فوائد کی بھی اجازت دیتا ہے۔غذائی خوراک اور متبادل فائبر کی فراہمی کے ساتھ ہی بگڑتے موسمیاتی نظام کی تخفیف کا بھی ذریعہ بنتا ہے۔

بانس دُنیا کے معتدل خطوں کی اہم قدرتی نباتات ہے ۔یوروپ اور انٹارکٹیکا کے علاوہ ہر براعظم میں اس کی کاشت ہوتی ہے۔تازہ ترین اندازے کے مطابق دُنیا بھر میں تقریباً 5050 ملین ہیکٹر بانس ہوسکتے ہیں۔ اقوام متحدہ نے سال 2021 سے 2050 کو 'ماحولیاتی نظام کی بحالی پر مشتمل دہائی' قرار دیا ہے۔ یعنی اس ایک دہائی کے دوران عالمی سطح پر

جنگلات کی کٹائی اور تنزل شدہ ماحولیاتی نظام کی بحالی کے لیے ضروری تحریکوں کو فعال بنانے اور تنظیموں کو متحرک کرنے کے لیے عالمی سطح پر جدوجہد کو فروغ دیتا ہے۔ جنگلات کی انواع و اقسام کی حفاظت کی ضمانت دینا، آب وہوا کی تبدیلی کو کم کرنا اور معاش کو بہتر بنانا، جیسے فیصلہ ساز اقدامات کو بانس کی کاشت کے ذریعے یقینی بنایا جاسکتا ہے۔ اس لیے آج کرۂ ارض پر صرف بانس کے بے جا استعمال کرنے کا وقت نہیں ہے بلکہ یہ وقت زیادہ سے زیادہ بانس لگانے کا ہے۔ بہتر مستقبل کے لیے پائیدار ماحولیاتی نظام کی تعمیر کرنے، سائنس و تکنیک کے بہتر استعمال کرنے، فن تعمیر اور فن موسیقی کو فروغ دینے اور نئی ایجادات کرنے، خوراک و ادویات کا بہتر متبادل اخذ کرنے، رہائش و مسکن کے لیے ضروری بنیادی اجزا کو تلاش کرنے، جمالیاتی صنعت کو بحال کرنے، معیشت کو فروغ دینے اور کھیل کود تفریح کی سمت نئی جدوجہد میں بانس کی انواع واقسام مفید اور کار آمد ثابت ہوتی ہے۔

قدرتی اشیا پر جدید تکنیک کے بجا استعمال کے اس دور میں خوبصورت ترین دنیا کی تشکیل و تعمیر میں بانس کی اہمیت و افادیت کو یوں ہی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح زوال پذیر ماحولیاتی نظام کی ازسر نو بحالی کے لیے بانس اور اس کی کاشت کتنا اہم کردار ادا کرسکتی ہے اسے یکسر فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آیئے ہم سب مل کر اعلیٰ و ادنیٰ پیمانے پر جس طریقے سے بھی ممکن ہوسکے اس کی کاشت پر زور دیں۔

{تعارف اپریل 2021 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں}

■

Naseem Sayeed
UDT, M.M. Rabbani High School
Kamptee- 441001,Distt.: Nagpur (MS)
Mob.: 7798274366

Subscription Form "Bachon Ki Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں بچوں کی دنیا' کا رکن سالانہ خریدار بننا چاہتا/ چاہتی ہوں۔

100 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................................. ...... بتاریخ...

بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/100 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009
میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'بچوں کی دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, Email.: magazines@ncpul.in

دستخط

یومِ آزادی

عائشہ سمن

پندرہ اگست یوم آزادی
آؤ بچو! کر کے منادی

کھیلیں، کودیں، ناچیں، گائیں
آزادی کا دن یوں منائیں

آؤ کریں ویروں کو یاد
جن کی بدولت ہم ہیں شاد

ہندو مسلم بوڑھے بچے
سکھ عیسائی مل کر سب نے

توڑی تھی زنجیر غلامی
تب پائی ہم نے آزادی

شوہر، بیٹا، باپ گنوایا
ماتھے پر اک بل نہ آیا

خاطر اوروں کے جو جیے گا
وہ امرت کا جام پیے گا

محنت سیڑھی ہے عظمت کی
محنت ہی سے ہے عزت بھی

وقت پہ تم اسکول کو جاؤ
پڑھ لکھ کر عالم بن جاؤ

اپنے وطن سے کر کے محبت
اپنے چمن کی کرنا حفاظت

ہندوستان سے پیار کرو گے
نہرو اور آزاد بنو گے

اچھائی کے تم ہو راہی
تم ہی کل کے ویر سپاہی

بچو ! تم بھی سچے بننا
سچے بننا اچھے بننا

اچھے بن کر نام کمانا
بھارت کا تم مان بڑھانا

دنیا خوش اللہ بھی راضی
بن جاؤ گے اک دن غازی

{تعارف دسمبر 2020کے شمارے میں شائع ہو چکا ہے}

■

Dr. Aaisha M Tarique Shaikh
F No: 30, 1st Floor, Poo. Bohra Masjid
Near Pahelvi Hotel, Bazar Road(W)
Mumbai - 400050 (Maharashtra)

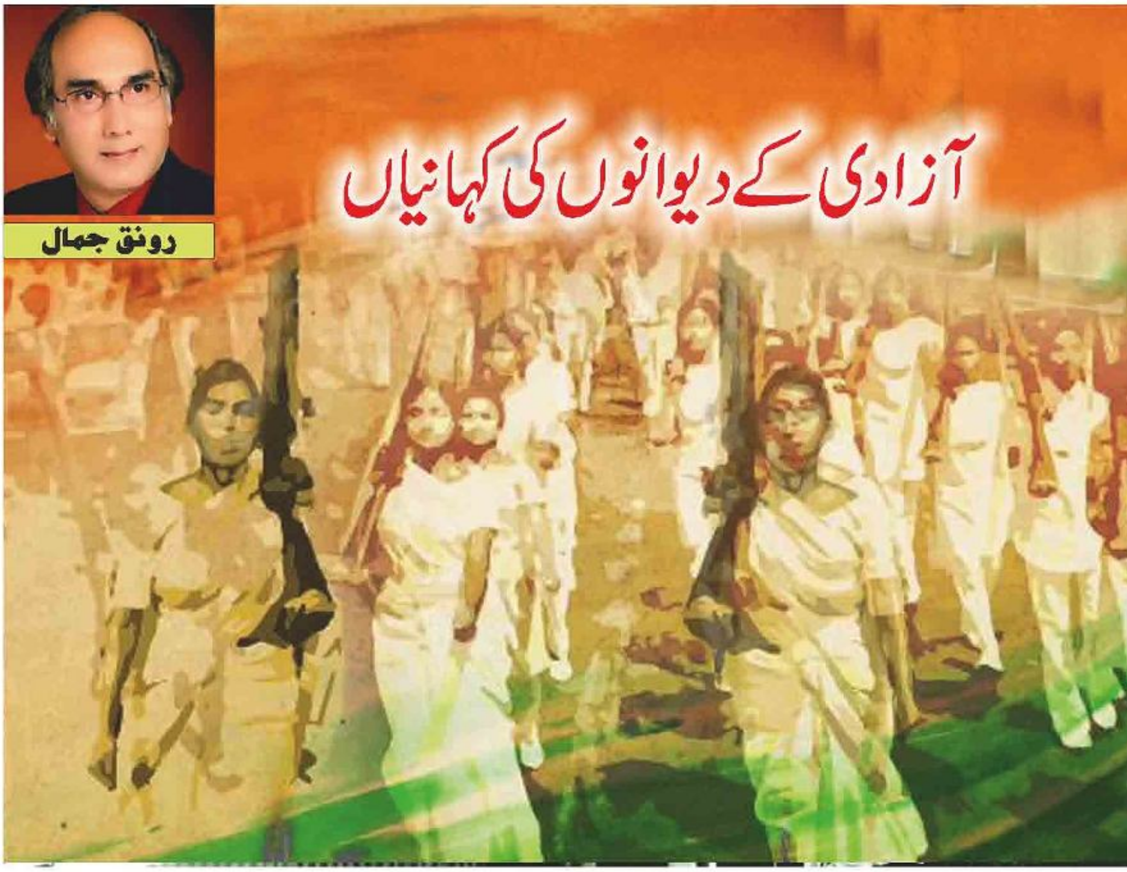

آزادی کے دیوانوں کی کہانیاں

رونق جمال

پندرہ اگست 1947 کو ہمیں آزادی ملی جس کی لڑائی رام پرساد بسمل، اشفاق اللہ خاں اور علامہ فضلِ حق خیرآبادی لڑے، انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگانے والے حسرت موہانی لڑے، تب ہمیں آزادی ملی، آزادی کے پروانوں نے کالے پانی کی صعوبتیں جھیلیں تب ہمیں آزادی ملی، بڑے بڑے صنعت کاروں نے اور علما نے جیل میں چکیاں پیسیں تب ہمیں آزادی ملی، گاندھی جی نے سوٹ اتار کر لنگوٹی پہنی تب ہمیں آزادی ملی، نہرو جی، جن کے کپڑے پیرس سے دہلی دھل کر آتے تھے، انھوں نے کھادی پہنی تب ہمیں آزادی ملی۔

1923 کی ایک بہت ہی نایاب تصویر ہاتھ لگی ہے اس میں آپ بائیں جانب سے مجاہد آزادی بیرسٹر عبدالمجید خواجہ، راجہ بہادر عطا، مہادیو دیسائی اور جارج جوزف کو آگرہ کی جیل میں دیکھ سکتے ہیں۔ بیرسٹر عبدالمجید خواجہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بنیاد گزاروں میں سے تھے۔ جارج جوزف کا تعلق کیرلہ سے تھا۔ 1922 میں آگرہ جیل میں ایک اور مجاہد آزادی مولوی صاحب سے اردو سیکھی تھی۔ 1932 میں بیلگام کی جیل میں مجاہد آزادی مولوی صاحب سے فارسی اور فرینچ سیکھی تھی۔ 1942 میں پونے کے آغا خان پیلیس میں گاندھی جی کے ساتھ قید میں رہتے ہوئے آخری سانس لی تھی۔

ملک کے پہلے وزیر تعلیم جناب ابوالکلام آزاد صاحب جیل میں تھے۔ نہرو جی نے انھیں جیل جا کر بتایا کہ ان کی بیگم شدید بیمار ہیں۔ ان کی دیکھ بھال کے لیے آپ کو گھر جانا چاہیے۔ میں نے جج سے بات کر لی ہے اگر آپ کورٹ میں درخواست دے دیں تو صبح جج آپ کو رہا کر دے گا۔

مولانا آزاد نے لکھ کر دینے سے انکار کردیا اور نہرو جی سے صاف صاف کہہ دیا.. میری بیوی بیمار ہے... لیکن میری آپ کی ہماری ماں غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اسے آزاد کرانے کے لیے میرا جیل میں رہنا ضروری ہے۔ لیکن آپ اگر بیگم کی تیمارداری کے لیے گھر نہیں گئے تو وہ آپ کے انتظار میں مرجائے گی۔ مولانا نے فخر سے کہا... ملک کے لیے میں بیوی کو قربان کرسکتا ہوں لیکن بیوی کے لیے ملک کو نہیں۔

ہمارا پیارا ترنگا! جو آج ہماری آن بان اور شان ہے اس کو بنانے والی ایک مسلم خاتون ثریا طیب صاحبہ ہیں۔ محترمہ کے شوہر بدرالدین طیب آئی ایس آفیسر تھے اور جمہوری جھنڈے کو بنانے والی پانچ رکنی کمیٹی کے اہم رکن تھے۔ سب سے پہلے 1921 میں جمہوری جھنڈے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ گاندھی جی کی خواہش کے مطابق ترنگے میں تین رنگ شامل کیے گئے تھے۔ آزادی کے بعد وہی جھنڈا قومی جھنڈا بنایا گیا اور آج تک ساری دنیا میں یوم آزادی اور یوم جمہوریہ کے موقعے پر شان کے ساتھ لہرایا جاتا ہے۔

جنرل ڈائر نے 13 اپریل 1919 کو بیساکھی کے تہوار کے روز جلیان والا باغ میں اندھا دھند گولیاں چلوا کر سیکڑوں بے گناہوں کو شہید کردیا تھا جس میں مرد عورتیں بوڑھے بچے شامل تھے، کئی لوگ جلیان والا باغ کے کنویں میں جان بچانے کے لیے کود پڑے تھے۔ دوسرے روز کنویں سے ایک سو بیس لاشیں برآمد ہوئی تھیں۔ بریگیڈیئر جنرل ریزی نول ڈائر اور اس کے ماتحت لیفٹیننٹ گورنر مائیکل اور ڈائر نے تقریباً 1650 راؤنڈ گولیاں چلوائی تھیں لگاتار دس منٹ فائرنگ چلتی رہی اور تب رکی جب سپاہیوں کے پاس گولیاں ختم ہوگئی تھیں۔ جلیان والا باغ میں کئی مسلمان شہید ہوئے تھے جن کے سینوں پر گولیاں لگی تھیں۔ جنرل ڈائر 1927 میں قدرتی موت مرگیا لیکن لیفٹیننٹ گورنر مائیکل او ڈائر انگلینڈ واپس چلا گیا تھا۔ 1940 میں ایک نوجوان ادھم سنگھ نے ایک بھرے ہال میں ڈائر کو گولیوں سے چھلنی کر کے ختم کردیا تھا۔ اودھم سنگھ کو بھی پھانسی کی سزا دی گئی تھی۔

ملک کی آزادی میں بچوں کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ ننھے منے بچے بھی محلے کے گلی کوچوں میں انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگاتے گھوما کرتے تھے۔ ایک بار ایک پولس والے نے چند بچوں کو انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگاتے ہوئے گرفتار کرکے انگریز افسر کے سامنے پیش کردیا۔ انگریز افسر نے سات آٹھ سال کے بچوں کو دیکھا تو مسکرایا اور کرسی سے اٹھ کر بچوں کے قریب گیا اور پیار سے بولا... ''بچوں تم یہ نعرہ لگانا چھوڑ دو تو میں تمھیں چھوڑ دوں گا اور ڈھیر سارے چاکلیٹ بھی دوں گا'' بچے انگریز افسر سے ڈرے نہ گھبرائے اور بیبا کی سے بولے ''انگریز صاحب آپ ہمارے ملک کو آزاد کردو تو ہم سب آپ کو ڈھیر ساری چاکلیٹ دیں گے!'' انگریز افسر بچوں کا جواب سن کر مسکرا دیا اور بچوں کو چاکلیٹ دے کر چھوڑ دیا، لیکن اس کے چہرے پر فکر و پریشانی کے آثار صاف دکھائی دے رہے تھے۔ کہ جس ملک کے بچے بھی آزادی چاہتے ہیں بھلا وہ کیسے غلام رہ سکتا ہے اور کب تک! آخرکار ہمارا ملک آزاد ہوگیا اور ہم آزادی کی 75 ویں سالگرہ منا رہے ہیں!

{تعارف فروری 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے}

■

Raunaq Jamaal
'Kainat', Street No 9, New Adarsh Nagar
Durg - 491001 (Chhattishgarh)
Mob.: 8839034844

یہ میرا ہندوستان

خلیق الزماں نصرت

سارے جگ سے ہے مہان
یہ میرا ہندوستان
پیاری مجھ کو عظمت اس کی
صدقے اس پر میری جان

سارے جگ سے ہے مہان
یہ میرا ہندوستان

بستی بستی جنگل جنگل جیون کی رت چاروں اور
آنکھوں میں ٹھنڈک پڑ جائے جب جب پر پھیلائیں مور
ندیاں نہریں باغ بغیچے ہرے بھرے کھیت اور کھلیان

سارے جگ سے ہے مہان
یہ میرا ہندوستان

میرے ہندوستان کی دھرتی سارے جگ سے نیاری
رنگ رنگ کے پھول ہیں جس میں یہ ایسی پھلواری
ہندو مسلم سکھ عیسائی سب جیسے اک خاندان

سارے جگ سے ہے مہان
یہ میرا ہندوستان

سب کو آزادی کی خوشیاں راحت کا سامان ملے
ہر دل سے کی پیڑا مٹ جائے ہونٹوں کی مسکان ملے
پورا ہو برسوں کا سپنہ رہ جائے پرکھوں کی آن

سارے جگ سے ہے مہان
یہ میرا ہندوستان

■

Khaleequzzman Nusrat
861/nd Floor 203/ Opp
Salauddin Apyyubi School
Bhiwandi - 421302 (Maharashtra)
Mob.: 9923257606

آزاد بھارت اور ہم

ترنم جہاں شبنم

ترنم جہاں شبنم کا تعلق مراد آباد سے ہے۔ انھوں نے اردو اور تاریخ سے ایم اے کیا ہے اور جامعہ اردو علی گڑھ سے معلم اردو کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ہندوستان کے معتبر اخبارات و رسائل میں ان کے افسانے اور مضامین شائع ہوتے رہے ہیں۔ سوشل میڈیا پر متحرک اور فعال ہیں۔ شعاعِ افسانہ وہاٹس ایپ گروپ کی ایڈمین بھی ہیں۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'چاندگہن کے بعد' زیرِ ترتیب ہے اور بچوں کے لیے بھی ایک کتاب 'دوستی' کے عنوان سے زیرِ تکمیل ہے۔

آزادی ایک نعمت ہے اور اسے وہی سمجھ سکتا ہے جس نے غلامی میں زندگی گزاری ہو۔ آج ہم جس ملک میں رہتے ہیں اور جس فضا میں سانس لیتے ہیں وہ آزاد ہے اور ہم آزاد بھارت کے باشندے ہیں۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ ہمارا ملک ہندوستان بھی کبھی غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا۔ ہاں بھئی کیوں نہیں جانتے ہوں گے؟ یہ سبق تو آپ نے اپنی تاریخ کی کتاب میں ضرور پڑھا ہوگا کہ 1947 سے پہلے ہمارا ملک ہندوستان یا بھارت ورش انگریزوں کا غلام تھا اور یہاں انگریز حکمرانوں کا راج تھا۔

برطانیہ کی ایک کمپنی ایسٹ انڈیا کمپنی جو مغل بادشاہ جہانگیر کے زمانے میں تجارت کے مقصد سے ہندوستان آئی اور آہستہ آہستہ یہاں قابض ہوتی چلی گئی۔ دراصل بادشاہ سے کمپنی کے معاہدے کے تحت کمپنی کو یہاں کے بندرگاہوں اور شہروں کو خرید و فروخت کے لیے تجارتی مقاصد سے استعمال کی اجازت دی گئی تھی۔ یہاں سے کمپنی سوت، ریشم، پوٹاشیم نائٹریٹ اور چائے خرید کر بیرون ممالک مہنگے داموں میں فروخت کر کے خوب منافع کماتی۔ بدلے میں یورپی مصنوعات ہند کو دینے کا وعدہ کیا تھا لیکن اس زمانے میں وہاں کچھ خاص بنتا نہیں تھا۔ اس لیے باہری ممالک کی نظر ہندوستان پر ہی رہتی تھی۔ اس طرح تجارتی مقاصد سے ہندوستان کاروبار کرنے آئی ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان بھر میں قابض ہوتی چلی گئی۔ اگر اس کا مقصد کاروباری رہتا تو کوئی بات نہیں تھی مگر یہاں کی دولت دیکھ کر اس کی نیت خراب ہوتی چلی گئی۔ اور وہ ہندوستان پر حکومت کے خواب دیکھنے کے ساتھ اپنی سیاسی پالیسیاں بنانے لگی۔

بنگال کے نواب کی فوج کے ایک کمان دار میر جعفر کو ساتھ ملا کر کمپنی نے 1757 میں پلاسی کے مقام پر نواب کی فوج کو شکست دے کر میر جعفر کو بنگال کے تخت پر بیٹھا دیا اور اس سے خراج وصول کرنے لگے۔ اس طرح چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹے ہندوستان بھر میں یہ آگ پھیلتی چلی گئی۔ انگریزوں کو جہاں موقع ملتا معصوم ہندوستانیوں کو اپنی سیاسی عیاریوں میں پھنسا کر ان کا مال لوٹتے اور ان کے احتجاج کرنے پر سیاسی پالیسیاں بنا کر ان پر ظلم کرتے۔ اس طرح انگریزوں کا ظلم و تشدد بڑھتا چلا گیا۔ جس کا شکار معصوم ہندوستانی ہوتے چلے گے اور ڈیڑھ صدی تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ وقت کے ساتھ آہستہ آہستہ ہندوستانیوں کو سمجھ آتی گئی اور وہ انگریزوں کی چالوں کو سمجھنے لگے۔ اور اپنے حقوق کے لیے انگریزوں کے خلاف

آوازیں بلند کرنے لگے۔ جس کی شروعات 1857 میں منگل پانڈے نے میرٹھ سے کرتے ہوئے جنگ آزادی کا اعلان کر دیا۔ ہوا یہ تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی نے بندوق کے جو کارتوس بنائے تھے اس میں گائے اور سور کی چربی کا استعمال کیا گیا تھا اور کارتوس منہ سے کھینچ کر کھولنا ہوتا تھا ایسے میں اسے منہ میں لینا ہندو اور مسلمان دونوں کے عقائد کے خلاف تھا۔ اور یہیں سے ہندو اور مسلمانوں نے مل کر انگریزوں کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا۔

1857 سے وطن کو آزاد کرانے کے لیے جنگ آزادی کا جو یہ سلسلہ شروع ہوا وہ 15 اگست 1947 پر آزادی کے ساتھ ختم ہوا۔ لیکن اتنے برسوں میں کتنے ہی لوگوں نے اپنا لہو بہا کر اپنی جانیں قربان کر کے ہمیں اس آزادی سے ہم کنار کروایا۔ جس میں منگل پانڈے جیسے نا جانے کتنے اور بہادر شامل ہیں۔ جھانسی کی رانی لکشمی بائی جنہوں نے انگریزوں کے آگے گھٹنے نہیں ٹیکے اور دو ہفتوں تک ان سے جنگ کی۔ بہادر شاہ ظفر نے بادشاہ ہوتے ہوئے اپنے بیٹوں کے کٹے سر دیکھے اور ملک بدر کیے گئے۔ قید خانے کی مصیبتیں اٹھائیں۔ اشفاق اللہ خان، بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، سبھاش چندر بوس، بال گنگادھر تلک، مدن موہن مالویہ، رام کمار بسمل، جواہر لعل نہرو، سردار پٹیل اور گاندھی جی کے علاوہ متعدد نام ہیں جنہوں نے ملک کو آزاد کرانے کے لیے تحریکیں شروع کی نعرے بلند کیے گھر بار چھوڑ کر ملک کو آزاد کرایا۔

بھگت سنگھ ایسا نام ہے جن کے چچا اور والد دونوں ہی آزادی کی لڑائی میں شریک تھے۔ بچپن سے ہی انھوں نے چچا اور والد کو آزادی کے لیے جد و جہد کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کے دل میں بھی وطن کی محبت اور اسے آزاد کرانے کا جذبہ تھا۔ جس کے لیے انھوں نے پنجاب میں نوجوانوں کے ساتھ مل کر انگریزوں کے خلاف ایک تنظیم بنائی اور آزادی کے لیے آواز بلند کی۔ چندر شیکھر آزاد کے ساتھ مختلف تحریکوں میں شامل رہے۔ اور 1929 میں پارلیمنٹ پر بم پھینکنے کے الزام میں انھیں جے دیو اور راج گرو کے ساتھ پھانسی کے تختے پر لٹکا دیا گیا۔

آزادی کی لڑائی میں ایک اہم کردار مہاتما گاندھی کا ہے جنہیں ہم باپو بھی کہتے ہیں۔ آزادی کے لیے جو خون خرابہ ہو رہا تھا گاندھی جی نے اسے روک کر عدم تشدد کا راستہ دکھایا اور بتایا کہ یہ لڑائی بنا خون خرابے کے بھی لڑی جا سکتی ہے۔ ان کا ماننا تھا اتنے برسوں میں آزادی کے لیے جو خون خرابہ ہوا ہے وہ قربانیاں رائگاں نہیں جائیں گی۔ لیکن اب ہندوستانیوں کو خون خرابے کا راستہ چھوڑ کر اہنسا (عدم تشدد) کا پالن کرنا ہوگا خاموش احتجاج کے ذریعے انگریزوں کو بھارت سے جانے کے لیے مجبور کرنا ہوگا۔ انھوں نے کبھی انگریزوں کو ایک گالی بھی نہیں دی اور خاموش احتجاج شروع کیے اور مختلف تحریکیں چلائیں مگر اہنسا کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا۔ ستہ گرہ، نمک تحریک، انگریز بھارت چھوڑو جیسی تحریکیں چلا کر انگریزوں کو بھارت چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اور اس طرح ان تمام لوگوں نے مل کر 15 اگست 1947 کو ہندوستان کو انگریزوں یا ایسٹ انڈیا کمپنی کے چنگل سے آزاد کرایا۔ اس لیے 15 اگست کی ہندوستان کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت ہے۔ جسے ہم ہر سال یوم آزادی کے طور پر مناتے ہیں۔

■

Tarannum Jahan Shabnam
H-76, Muradi Road, Near Shahab Masjid
Batla House, Okhla
New Delhi - 110025
Mob.: 9266860756

ترنگا ہمارا

ہے آنکھ کا تارا ترنگا ہمارا
یہ دل کا سہارا ترنگا ہمارا

سبھی کو ہے پیارا ترنگا ہمارا
ہے روشن ستارہ ترنگا ہمارا

ہے ہر ایک ہندی کو اس سے محبت
منور نظارہ ترنگا ہمارا . . . !

پلاتا ہے یہ جام الفت سبھی کو
ہے گنگا کا دھارا ترنگا ہمارا

یہ سرحد ہماری ہے سن سرحدی تو
ہے اس نے پکارا ترنگا ہمارا

■

Khalid Sarhadi
1st Lane, H No.: 48, Parbhudha Nagar
Near Aisha Nagar
Malegaon- 423203 (Maharashtra)

شکیب ثاقب
ابن شمشاد راضی

یوم آزادی

رسمِ وفا خلوص بڑھانے کا دن ہے آج
نفرت دلوں سے اپنے مٹانے کا دن ہے آج

پیغام امن سب کو سنانے کا دن ہے آج
بغض و حسد کی شمع بجھانے کا دن ہے آج

مسکن پہ اشکبار کے چلتے ہیں آیئے
ہے پندرہ اگست ہنسانے کا دن ہے آج

خوشیاں مناؤ بھول کے رنج و الم سبھی
اے دوستو! خوشی ہی منانے کا دن ہے آج

ان کی جو پی کے جامِ شہادت چلے گئے
قربانیوں کو یاد دلانے کا دن ہے آج

مذہب کا امتیاز نہ مسلک کی بات کر
ہر ایک کو گلے سے لگانے کا دن ہے آج

ہے ارتقا کا راز نہاں اتحاد میں
اہل وطن کو یہ بھی بتانے کا دن ہے آج

مدہوش ہیں جو نیند میں غفلت کی اے شکیب
ان کو محبتوں سے جگانے کا دن ہے آج

■

Mohammad Shakeb S/o Shamshad Ahmad
Kanchan Gali, Madanpura
Chiraiyakoat Road
Mau Nath Bhanjan - 275101 (UP)
Mob.: 9235079714

بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر نظر رکھنا ضروری ہے

بچے سچے اور بھولے بھالے ہوتے ہیں۔ بچوں سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ادیب الاطفال مرحوم ظفر گورکھپوری نے بڑوں کو تاکید کی تھی۔

بڑوں میں رہ کر سلیقے تو تم نے سیکھ لیے
شعور صحبت طفلاں کے بعد آئے گا

س: بچپن کی کون سی باتیں، شوخیاں، شرارتیں اب بھی آپ کو بہت یاد آتی ہیں؟

ج: بچپن انسانی زندگی کا دور اول ہے۔ اسی پر زندگی کی تعمیر و تشکیل منحصر ہوتی ہے۔ بچپن کی باتیں، راتیں اور یادیں امٹ ہوتی ہیں۔ ہم اسے فراموش نہیں کرسکتے۔ مجھے بھی اپنے بچپن کی باتیں آج بھی یاد آتی ہیں۔ جماعت اول کے استاد محترم مرحوم نوراللہ خان، ان کی نظمیں باآواز بلند پڑھنا، گاؤں میں آیا بندروالا، ڈگ ڈگ اس نے ایسی بجائی، انگور کھٹے ہیں، ڈاکیہ اور پولس والا' ابھی تک ذہن میں ہیں۔ مرحوم غلام دستگیر خود محنت سے پڑھاتے اور طلبہ سے بھی محنت کروائی جاتی تھی۔ مرحوم ظفریاب الدین سر کی پنجم جماعت کی انگریزی پڑھانا، آج گریجویٹ طلبا کو پڑھانا تھا، سوالات اور جوابات انگریزی میں ہوتے تھے۔ Where do you live، طلبا انگریزی میں ہی جوابات دیتے تھے۔ بچپن کے ساتھیوں کی آپسی محبت و میل جول، ہمدردی، صاف گوئی، ان کی دوستی، دشمنی اور اساتذہ حضرات کی محنت و ایمانداری، محبت اور دلچسپی سے پڑھانا، یہ تمام باتیں، بچپن کی یادیں بن گئیں، لیکن میں نے انھیں سنگ میل کی حیثیت سے اپنایا ہے۔

عبدالعزیز عرفان

غریبی بہت سی چیزیں چھین لیتی ہے۔ ہنسی اور شرارت کا موقع بھی کم دیتی ہے۔ ساتھیوں کے ساتھ شرارت میں شریک ہوجاتا تھا۔ مسجد کی ایک شرارت ابھی تک یاد ہے۔ امام صاحب سورہ رحمٰن کی تلاوت کرتے اور جب فبایّ الاءِ ربّکُ ماتکذبن پڑھتے۔ بچے ایک ساتھ آواز لگاتے، کھینچ کے بان، کہتے اور بھاگ جاتے تھے۔ آج اس سورت کو پڑھتا ہوں تو بچپن کی وہی شرارت پر ہنسی آتی ہے۔

س: بچپن میں آپ کے پسندیدہ مصنّفین کون تھے اور اب کون ہیں؟

ج: اسکول اسمبلی میں اکثر نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔ پروردگار عالم تیرا ہی ہے سہارا، لب پہ آتی ہے دعا، علامہ اقبال، حالی، اسمٰعیل میرٹھی کی نظمیں نصابی کتابوں

میں ہوتی تھیں۔ انھیں اکثر پڑھا جاتا تھا۔ یہی شعراپسند کیے جاتے تھے۔اب تومیرے پسندیدہ مصنّفین میں حضرت امیر خسرو، اورمولانا ابوالکلام آزاد کا شمار ہوتا ہے۔

س: بچپن میں کس کتاب نے آپ کو سب سے زیادہ متاثر کیا؟

ج: افرادِ خاندان ان پڑھ تھے۔ اپنی دنیا ہی محدود تھی۔ پرائمری اسکول میں لائبریری اور اساتذہ سے کتابیں ملتی تھیں۔ اسے ہی خزانہ سمجھا جاتا تھا۔ مضمون اور کہانی پڑھتے تھے۔مصنف کا خیال کیوں آتا؟

س: بچپن میں بچوں کے کون سے رسائل آپ پڑھتے تھے؟

ج: بچپن میں بچوں کے رسائل میں ماہنامہ غنچہ اور کھلونا جماعت سوم میں پڑھنے کا شوق تھا۔

س: بچوں کی ذہنی وفکری ارتقا کے لیے کون سی کتابیں زیادہ مفید ہیں؟

ج: بچوں کی ذہنی اور فکری ارتقا کے لیے مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور سائنسی کتابیں زیادہ مفید ہیں۔

س: زبان وبیان کو بہتر بنانے کے لیے کن مصنّفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہوسکتی ہیں؟

ج: زبان وبیان کو بہتر بنانے کے لیے مندرجہ ذیل مصنّفین کی کتابیں بچوں کے لیے رہنما ثابت ہوسکتی ہیں۔ان میں چند کے نام یہ ہیں۔ مولوی نذیر احمد، راشد الخیری، اسمٰعیل میرٹھی، صالحہ عابد حسین، بانو سرتاج، وکیل نجیب وغیرہ۔

س: مستقبل اور اپنے کریئر کو سنوارنے کے لیے بچوں کو کن موضوعات اور کتابوں کا مطالعہ کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا؟

ج: مستقبل اور اپنے کریئر کو سنوارنے کے لیے بچوں کو مختلف موضوعات مثلاً تاریخ، سائنس، جنرل نالج اور نصابی کتابوں کا مطالعہ کرنا فائدہ مند ثابت ہوگا۔

س: اپنے سوانحی اور تعلیمی کوائف کے بارے میں کچھ بتائیں؟

ج: نام شیخ عزیز شیخ مجید، ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان کے قلمی نام سے معروف ہوں۔ غریب خاندان میں پروردہ پہلا تعلیم یافتہ ہونہار طالب علم، مرحوم داداجانی شیخ تراب کے سایہ عاطفت سے تعلیم کا حصول، محنت، لگن اور دلچسپی والدین کی دعاؤں اور رہنمائی، شریک حیات صابرہ صدیقی کے تعاون اور محبت نے ٹریپل ایم اے، بی ایڈ، پی ایچ ڈی ڈگری یافتہ اور کتابوں کا تخلیق کار بنایا۔ 2004 تک درس وتدریس سے منسلک رہا۔ وظیفہ یاب ہونے کے بعد بھی العرفان ہائی اسکول خلدآباد اور ایس ایس اے سے آٹھ سالوں تک اپنے تعلیمی فرائض انجام دیے۔ اللہ رب العزت کا کرم ہے کہ مختلف موضوعات پر 39 کتابیں منظر عام پر آگئیں۔میری خوش نصیبی ہے کہ قومی کونسل برائے فروغ اردوزبان نئی دہلی کے جریدے، اردو دنیا، خواتین دنیا اور بچوں کی دنیا میں خطوط، تبصرے اور مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں۔

س: آپ کو بچوں کے لیے لکھنے کا خیال کب اور کیسے آیا؟

ج: 1977 میں میرا تقرر بحیثیت مدرس ضلع پریشد (ہائی اسکول) میں ہوا۔ چند سالوں کے تجربے اور مشاہدے سے محسوس کیا کہ اسکول میں قومی رہنماؤں کے یوم پیدائش اور یوم وفات کا انعقاد ہوتا ہے۔ ہمارے بچوں اور اساتذہ کو ان کی معلومات میں کمی کا احساس ہوتا ہے۔ان سے ہمارے قومی رہنماؤں کا مختصر تعارف ضروری ہے چنانچہ اردو اور ہندی میں 'ہمارے نیتا' کا گلدستہ شائع کیا۔خواتین کی اصلاح کے لیے اردو ٹائمز ممبئی اور دیگر اخبارات میں مضامین تحریر ہونے لگے اور اس کا گلدستہ 'آنچل کے ستارے' منظر عام پر آیا۔آج تک بچوں کے لیے لکھنے کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ ادب اطفال پر 13 کتابیں، مختلف مضامین اور کہانیاں شائع ہوچکی ہیں۔

س: آپ کی پہلی تخلیق، کب اور کس رسالے میں شائع ہوئی۔

ج: ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران ایک لطیفہ اردو ٹائمز ممبئی

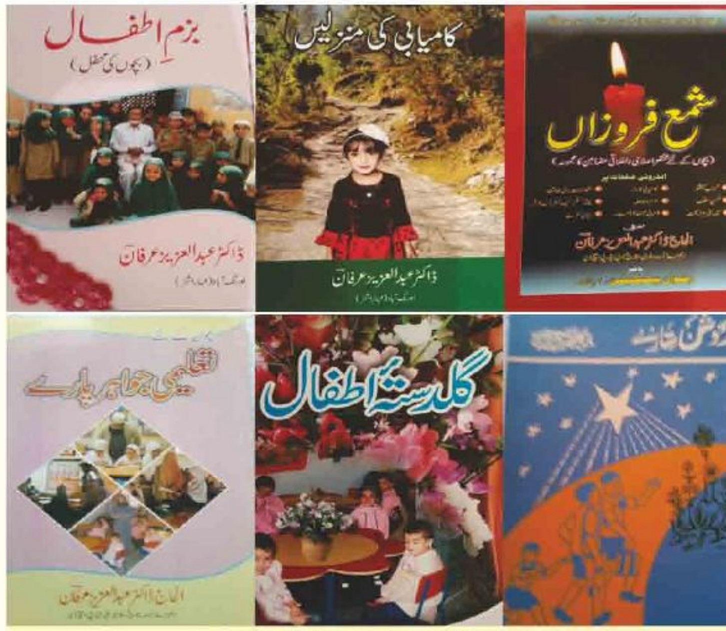

بچوں کے لیے عبدالعزیز عرفان کی کتابیں

اخبار میں شائع ہوا تھا۔ بعدازاں 'شمع فروزاں' کے تحت لکھنے لگا۔ اس طرح کہانیاں اور مضامین اخبارات ورسائل میں جگہ پانے لگے۔

س: آپ کے مرکزی موضوعات کیا ہیں؟

ج: 'ادب اطفال' کے مرکزی موضوعات میں تعلیمی، نفسیاتی اور اصلاحی نکتہ شامل ہے۔ تعلیمی اجزا میں متعلم، معلم، والدین کی اصلاح کے لیے مختلف موضوعات پر مضامین اور کہانیاں تحریر کرتا ہوں۔

س: کتاب لکھنے سے پہلے آپ بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر ریسرچ کرتے ہیں یا نہیں؟

ج: کتاب لکھنے سے پہلے بچوں کی نفسیات اور ذہنی مطالبات پر نظر رکھنا بہت ضروری ہے۔ بچوں کا مشاہدہ بے حد ضروری ہے۔

س: بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آپ کو کس طرح کی دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

ج: آج بچوں کے لیے لکھتے وقت دقتوں کا سامنا کرنا نہیں پڑتا ہے۔ چاروں طرف بچے ہیں۔ گھر میں بچے، باہر بچے ہیں۔ ان کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ ان کی نفسیات، پسند اور ناپسند، دلچسپی، توجہ اور ان کے کھیلوں، پڑھائی وغیرہ پر نظر ہوتی ہے۔ اللہ کے فضل وکرم سے بچوں کے کسی بھی موضوع پر قلم اٹھ سکتا ہے۔

س: ادیب اطفال کی حیثیت سے ادبی اور علمی حلقے میں آپ کی قدر ہوتی ہے یا نہیں؟

ج: اردو داں طبقہ گروہ بندی میں منقسم ہے۔ آپسی اتحاد ومحبت واپنائیت کے جذبے میں کمی دکھائی دیتی ہے۔ علاقائیت، سیاست اور گروپ بازی، اپنا کام کرتی ہے۔ اس لیے مستحق کے ساتھ انصاف نہیں ہو پاتا ہے۔

س: کیا آپ اب بھی بچوں کے لیے لکھی گئی کتابیں پڑھتے ہیں؟

ج: جی۔ بیشک پڑھتا رہتا ہوں۔ ادب اطفال اور ادیب الاطفال کے بارے میں بہت سی معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ 'ادیب الاطفال' کے خیالات کا اندازہ ہوتا ہے۔

س: انگریزی اور دیگر زبانوں میں شائع ہونے والے کون سے رسالے بچوں کے لیے مفید ثابت ہوسکتے ہیں؟

ج: انگریزی، مراٹھی اور ہندی زبانوں میں شائع ہونے والے رسالے مفید ثابت ہوسکتے ہیں۔ انھیں آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے۔

س: کیا اردو میں بچوں کے لیے انگریزی، تیلگو اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا کوئی مکمل رسالہ موجود ہے؟

ج: اردو میں بھی انگریزی اور دیگر زبانوں جیسا شائع ہونے والا مکمل رسالہ موجود ہے۔ وہ رسالہ ہے 'ماہنامہ بچوں کی دنیا'

جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کی اشاعت ہے۔ ہندوستان کا واحد کثیر الاشاعت اور منفرد 'بچوں کا ماہنامہ' ہے جو ہر طرح سے مزین ہے۔ آج کل اس کا شمار درجہ اول ماہنامہ کی حیثیت میں ہوتا ہے۔ بعد ازاں امنگ دہلی، صلاح کار اور دیگر رسائل وغیرہ کی درجہ بندی کی جاسکتی ہے۔

س: بچوں کے ادب پر جو رسائل شائع ہو رہے ہیں، ان کے مواد اور زبان و بیان سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: ان میں کچھ رسائل مواد اور زبان و بیان کے اعتبار سے اچھے ہیں۔ زبان و بیان سادہ اور سلیس ہی ہونا چاہیے۔ آج کے معیار کے مطابق بھی ضروری ہے تاکہ اساتذہ بھی سمجھیں اور طلبہ بھی مواد بھی ان کی نفسیات، عمر، پسند اور دلچسپی کے مطابق ہو۔

س: معاصر ادب اطفال سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

ج: ادب اطفال عصر حاضر کی ضرورت ہے۔ اطمینان بخش کہہ سکتے ہیں لیکن توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ دیگر اصناف کی طرح ادب اطفال کی ترقی و بقا کے اقدامات کیے جائیں جس سے ادب اطفال صحیح سمت میں ترقی کی راہ پر گامزن ہو سکے۔

س: بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں کن موضوعات پر زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے؟

ج: بچوں کے لیے لکھتے ہوئے آج کے دور میں مندرجہ ذیل موضوعات پر تو زیادہ توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ ہمیں مجموعی طور پر بچوں کی نفسیات، عمر، جنس، ذہنی سطح، زبان و بیان، رجحان، دلچسپی، پسند اور ناپسند، اور اصلاحی و اخلاقی پہلوؤں پر روشنی ڈالنی ہوگی۔ سائنسی رجحان پیدا کرنا ہوگا۔ ساتھ ہی معذور و ذہنی و دیگر مسائل رکھنے والے بچوں پر بھی لکھنا ہوگا۔

س: بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے؟

ج: بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کچھ مفید تجاویز اور مشورے ملاحظہ فرمائیں:

اول الذکر دھیان رہے کہ تعلیم و تربیت دونوں عناصر مختلف ہیں۔ والدین پر یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد کی صحیح تعلیم و تربیت کریں۔ ہر دور میں ان کی نگہداشت اور نگرانی کریں۔ اچھی صحت اور اچھا ماحول فراہم کریں۔ نفسیاتی طور پر بچے محبت کے متلاشی ہوتے ہیں۔ والدین ان سے محبت ضرور کریں۔ ان کی عصری و دینی تعلیم کا انتظام کریں۔ ان کی ضروریات اور مسائل پر توجہ فرمائیں۔ بچپن سے ہی ان کے عادات و اطوار، اخلاق، ادب و فرمانبرداری جیسی خوبیوں کی تربیت کریں۔ اساتذہ اپنے فرائض ایمانداری اور سچائی کے ساتھ مکمل کریں۔ طلبا کی پوشیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کریں۔ ان کی ضروریات اور مسائل پر بھی توجہ فرمائیں۔ ایک استاد اپنے طلبا کی صحیح تعلیم و تربیت سے انہیں ایک اونچے مقام و مرتبے پر پہنچانے میں معاون و مددگار ہو سکتا ہے۔ اس کی رہنمائی تعلیم و تربیت پر منحصر ہے۔

س: ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' میں آپ کس نوع کی تبدیلی چاہتے ہیں؟

ج: ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' اندرونی و بیرونی طور پر ہر طرح سے مزین اور منور ہے۔ مجھے رسالے میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی ہے۔

س: بچوں کے لیے آپ کا کوئی پیغام؟

ج: بچوں کے لیے بقول شاعر یہی کہوں گا۔

کچھ کیے جاؤ لے کر نام خدا — کچھ نہ کرنا بڑی خرابی ہے
کامیابی کوئی چیز نہیں — کام کرنا ہی کامیابی ہے

{تعارف مارچ 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ھے}

■

Dr. Abdul Aziz Irfan
Opp. Maulana Azad College
National Colony/Plot - 34
Po.: Aurangabad- 431001 (Maharashtra)

محمد کلیم ضیا

نظم

چھتری

بارشوں کی آمد ہے
چھتریوں کی قلت ہے
باہر سب کو جانا ہے
چھتریوں کی حاجت ہے
تین بچے اسکولی
باقی سب ملازم ہیں
بچے مجھ سے کہتے ہیں
بارش کیوں یہ ہوتی ہے
ہوتی ہے تو ہوتی ہے
چھتری کو کیوں روتی ہے
بھیگنے کو جی چاہے
بیماری سے گھبرا کر
دل کی اسی خواہش کو
ہم نے روند ڈالا ہے
اس طرح کہ جیسے کل
دل کی ساری خواہشات
خاک میں ملا دی تھیں
کیا کریں کہ ہم بھی ہیں
جیتے جاگتے انساں
دل بھی تو دھڑکتا ہے
روز یہ مچلتا ہے
بچوں کی ہے یہ آرزو
اب کے برس اگر نہ ہو
چھتری تو پھر کیا کریں ہم
اسکول ہی نہ جائیں گے

باہر ہی نہ جائیں گے
جائیں گے تو بھیگیں گے
بھیگیں گے تو چھینکیں گے
چھینکیں گے تو کھانسیں گے
کھانسیں گے بھئی کھانسیں گے
خوب مزے سے کھانسیں گے
اک دن ابو ایسا ہوگا
ڈاکٹر جواب دے گا
وہ تو پیسے مانگے گا
آپ ہوں گے خالی ہاتھ
سارے رشتے ختم ہوئے
سارے ناطے ٹوٹ گئے
غربت بھی کیا بیماری ہے
ہم سب پر یہ بھاری ہے
اچھے بھلے انسانوں کو
انسانوں سے توڑے ہے
پیسہ ہے تو رشتے ہیں
رشتے ہیں بھئی ناطے ہیں
پیسے سب کو بھاتے ہیں
ہاں تو ابوّ بات ہے یہ
ڈاکٹر جواب دے گا
آپ چُپ ہوجائیں گے
جیتے جی مرجائیں گے
ہم تو مریں گے بعد میں
پہلے آپ ہی مرجائیں گے

آپ مریں تو ہم مریں
کیا کریں اور کیا نہ کریں
باہر جائیں یا نہ جائیں
چھتری پائیں یا نہ پائیں
بہتر ہوگا ابّو آپ
اس بارے میں نہ سوچیں کچھ
ہونا ہے جو ہو جائے گا
باہر ہم نہ جائیں گے
چھتری ہم نہ مانگیں گے
آپ ہی تو چھتری ہیں
اس چھتری میں رہ لیں گے
آپ سلامت سب ہیں باقی
اب اداسی چھوڑیے
دل سے سل کو جوڑیے
شکر خدا کا کیجیے
سارے مسئلے ہوگئے حل
برساتیں بھی جائیں گی
جائیں گی بھئی جائیں گی
چھتری کو یہ روتی ہیں
روتی ہیں تو رونے دو
ابّو کو پر ہنسنے دو
سب ہی کو بس ہنسنے دو
ہنسنے دو بھئی ہنسنے دو

{تعارف اپریل 2022 کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے}

■

Dr. Kalim Zia
A/103, Rawal Enclave, Rawal Nagar,
Opp.: Rawal School & College,
Nr: Mira Road Station, Mira Road
(East), Distt.: Thane- 401107 (MS)

برسات کا موسم

وزیر عالم

آسماں پر سیر کرتے بادلوں کا کارواں
رقص کرتی اڑتی پھرتی رنگ برنگی تتلیاں
اور اچھلتے کودتے مستی میں بچے بچیاں
ہر ڈال پیڑوں کی ہری سرسبز ہر اک پات ہے
واہ کیا موسم سہانا موسمِ برسات ہے

زندہ ہوجاتی ہے مٹی آمدِ برسات سے
نیز چھپ جاتی ہے دھرتی پودوں کی بہتات سے
اور ہریالی ٹپکنے لگتی ہے باغات سے
پیڑ پودوں کے لیے یہ قیمتی سوغات
واہ کیا موسم سہانا موسمِ برسات ہے

بادلوں کی گڑگڑاہٹ اور بجلی کی چمک
مینڈکوں کی ٹرٹراہٹ اور جگنو کی دمک
باغ میں بھنوروں کا آنا اور پھولوں کی مہک
سارے موسم سے جدا برسات کی ہر بات ہے
واہ کیا موسم سہانا موسمِ برسات ہے

موج بارش میں منانے کا مزہ کچھ اور ہے
مینہ برسے تو نہانے کا مزہ کچھ اور ہے
ناؤ کاغذ کی بہانے کا مزہ کچھ اور ہے
جس نے یہ موسم دیے ہیں وہ خدا کی ذات ہے
واہ کیا موسم سہانا موسمِ برسات ہے

■

Md. Wazeer Alam
Madrasa Rahmatul Uloom
Naukatola, Hardiya, Raxaul
East Champaran (Bihar)
Mob.: 9534443838

اردو

عبدالرزاق دل کھولاپوری

تھے جو اسلاف تجھے چاہنے والے اردو
جانفشانی سے تجھے اپنی، وہ پالے اردو
قدر جانی نہ تری ہم نے کبھی جانِ غزل
ماہنامے پڑھے تیرے نہ رسالے اردو
خوش کلامی تری ہر ایک سنا کرتا تھا
آ کے اب کون سنے گا ترے نالے اردو
سرپرستوں کو نہ بچوں کو ہے چاہت تیری
پڑ نہ جائیں ترے در پر کہیں تالے اردو
ہیں کتابیں کہیں دیمک زدہ اردو تیری
ہیں ذخیرے پہ ترے مکڑی کے جالے اردو
تیرے خسرو تھے پرستار اور بسمل و نسیم
میر و غالب نے تجھے خوب اچھالے اردو
اب بھی ہے وقت تجھے بلبل خوش رنگِ چمن
ہو نہ مایوس پر و بال سجا لے اردو
ہاں یہ حق بات ہے دل پر ہے عیاں ان کا خلوص
کچھ اداروں نے تجھے مل کے سنبھالے اردو

{تعارف دسمبر 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ھے}

■

Abdur Razzaque Dil Kholapuri
At+Post: Kholapur
Taq: Bhatkal
Distt.: Amravati - 444802 (Maharashtra)
Mob.: 7304485318

شاہد انور

ساتھی

میرا ننھا ہے من کورا کاغذ ہوں میں
سارے حالات میرے لیے عام ہیں
میں ہر اک بات پر غور کرتا رہوں
اس لیے ساتھ تیرا گوارا کیا
ہر خوشی میں ترا ساتھ نعمت ہی ہے
غم ذرا ہوں اگر تب بھی ڈھونڈوں تجھے
میری آنکھوں کی چاہت ترے واسطے
اور پہنچ میرے ہاتھوں کی تجھ تک ہی ہے
تیری تعلیم سے مجھ کو رستے ملے
میں نے انسانیت تجھ سے سیکھی سدا
تونے بانٹا ہے سب کچھ لیا کچھ نہیں
تو امر ہے امر ہی رہے گی سدا
سچی ساتھی ہے تو اے کتابِ کرم
میری رہبر ہے تو اے کتابِ حسیں

■

Shahid Anwar
Q-6/7, Opp.Hari Masjid,
Nafees Road, Batla House, Jamia Nagar,
New Delhi-110025
Cell : 9953122348

جاوید رانا

بچوں کے دوہے

ابو امی دیکھ کر کہیں ہمیں شاباش
آؤ کھیلیں دوستو! ہم تعلیمی تاش

بستے، ٹائی، جوتیاں جائیں سب اسکول
ہنستی گاتی تتلیاں چلتے پھرتے پھول

دیکھو آنکھیں کھول کے اونچے اونچے خواب
قابل بننا ہے اگر پڑھو سبھی کتاب

چڑیاں، چوزے، میمنے، تتلی کلیاں پھول
ہر بچے کے واسطے ماں پہلا اسکول

اوروں کے دکھ درد کا جب ہوگا احساس
جیون کے ایکزام میں تب ہوں گے ہم پاس

کیسی اونچی چوٹیاں کیا پربت کیلاش
اپنے دم پر جو اڑے وہ چھولے آکاش

■

Javed Rana
143/29 Near Char Mazar
Dr. Zakir Husain Ward, Mominpura
Burhanpur- 450331 (MP)
Mob.: 9009234875

ارم نعیم

آنکھ کھلتے ہی

آنکھ کھلتے ہی
وہ جو ایک چہرہ سامنے آیا
تو وہ تم تھی
سِنہ تھا چار برس کا
جب بابو چھوڑ چلے تھے ہم کو
اس لمحے سے تم ہی سب تھی
ماں بھی تم تھی، باپ بھی تم تھی
تم نے سکھایا تم نے پڑھایا
آج کیا اس قابل ہم کو
کچھ نہ سمجھ تھی دین کی ہم کو
نہ جانا تھا اس دنیا کو
سب کچھ تم نے ہی بتلایا
ہم تھے چار اور تم تھی اکیلی
پھر بھی تم ہمت نہ ہاری
جب ہم لڑتے تھے آپس میں
تم چھپ چھپ رو دیتی تھی
جب دیکھتے تمہارے آنسو
ہم ساکت ہو جاتے تھے
عید کا موقع جب آتا تھا
کپڑے کیسے بنتے ہمارے
بن والد کے چار یہ بچّے
ضد تم سے کر جاتے تھے

اے ماں! کیا تم کرتی تھی تب
وہ لمحہ بھی یاد ہے مجھ کو
سی دیتی تھی کپڑے کچھ تم
اور شاہی ٹکڑے تھی بناتی
جب ان سے چند پیسے آتے
تب ان پیسوں سے اے ماں تم
ہم چاروں کے خواب سجاتی
پر اے ماں اپنی خاطر
تم کچھ بھی نہ لاتی تھی
دل تو ہمارے پاس بھی ہے ماں
پر تم جیسا لائیں کہاں سے
ایک دنیا جنّت سی مماثل
اس میں ہے، ہم سب کے لیے
نہیں ستاتا کوئی بھی غم ماں
جس جا تم آ جاتی ہو
ہاتھ دُعاؤں کا سر پر جب
تم میرے رکھ جاتی ہو
جنّت کی بھینی بھینی سی
خوشبو ہر سو آتی ہے
چھاؤں میں اپنے آنچل کے تم
ٹھنڈی چھایا دیتی ہو
باپ نہیں ہوتے ہیں جن کے

وہ کیا کچھ بن جاتے ہیں
پر میری ماں ہم چاروں کو
تم نے کیا کچھ بنوایا
آنکھ کھلی اور ہوش سنبھالے
تم کو ہی سب کچھ پایا
تب بھی میری دنیا تم تھی
اور اب بھی سب کچھ ہو میرا
میری دنیا میرا عقبیٰ
سب تم سے وابستہ ہے
ہر لمحے میری یہ دعا ہے
رُخ پر تیرے ہو مسکان
آنکھ میں تیری اک آنسو بھی
نہ ہو میری امّی جان
نعم البدل نہیں اس کا کچھ
جو کچھ تم سے ہے پایا
اے ماں! تم نے نام ہمارے
کر دی ساری زندگانی
تم سے سارا وجود میرا
قائم دائم ہوا یہاں جب
اب تو جب تک سانس ہو میری
اس سے آگے ساتھ ہو تیرا

■

Eram Naim
Asst. Prof. Dept of Urdu
Govt Raza PG College
Rampur (UP)
Mob.: 7985705617

نظم

زمین کا تحفظ

جس زمین پر ہم بستے ہیں
اس کا قصہ کہتے ہیں
سنو لگا کر کان
جا سکتی ہے جان
گر جان ہمیں عزیز ہے
سمجھنے کی یہ چیز ہے
زمین بہت تیزی سے گرم ہو رہی ہے
ہوتی ہی جا رہی ہے
گرمی کی شدت اگر
اسی رفتار سے بڑھتی رہی
زمین پر زندگی کا خاتمہ طے ہے
آؤ! دوپہر کی دھوپ میں
ننگی سڑکوں پر گھومیں ہم
گرمی کی شدت کو محسوس کریں
کوئی سایہ تلاش کریں
درختوں کو کٹوائیں ہم!
پھر سایہ کہاں سے پائیں ہم!
چلو! نئے درخت لگائیں ہم
تیزی سے پھیلائیں ہم
یہ بات سب کو بتائیں ہم!

درخت ہے تو پانی ہے
پانی ہے تو زندگانی ہے
زندگانی ہمیں بچانی ہے
زمین کو ہرا بھرا کرو
پہاڑوں پر سبزے کو لہلہانے دو
بنجر زمین پر ہریالی کو بس جانے دو
ندیوں کو لہرانے دو
ہواؤں کو بل کھانے دو
جھرنوں کو گنگنانے دو
پرندوں کو چہچہانے دو
مویشیوں کو دوڑ لگانے دو
سب کو جھوم جھوم کر گانے دو
زمین ہے تم ہم ہیں
یہ نعرہ لگانے دو
زمین کو بچانے دو

■

Dr. Simmi D/o Md Mansoor Alam
C/o Sana Medical, Road No.1
New Karimganj
Gaya - 823001 (Bihar)
Mob.: 8130845047

ساحر نصرت

لوری

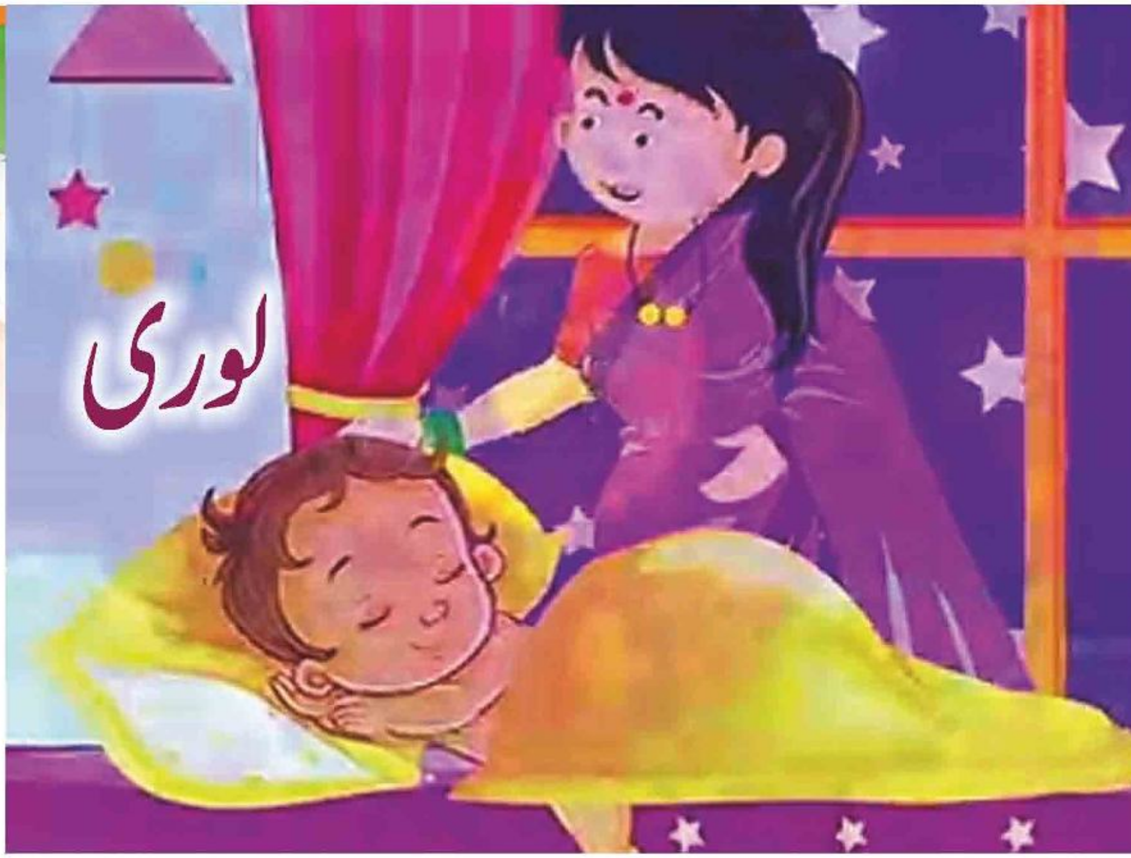

سوجا سو جا گڑیا رانی
تجھ کو سلانے نندیا آئی
میٹھے میٹھے سپنے لائی
سوجا سوجا گڑیا رانی
جھلمل جھلمل تارے بولے
چاند اگا ہے سارے بولے
کل کی باتیں ہوئیں پرانی
سوجا سوجا گڑیا رانی
بھیگی بھیگی رت کے لب پر
جاگی جاگی ہے یہ کہانی
رشک چمن تو رشک زمانی
سوجا سوجا گڑیا رانی

اندر باہر دائیں بائیں
روشن تجھ سے ہوئے نظارے
سب کی پیاری سب کی دلاری
سوجا سوجا گڑیا رانی
پھولوں میں ہے ذکر تمھارا
گلشن گلشن ڈالی ڈالی
تو ہے رحمت رب کی پیاری
سوجا سوجا گڑیا رانی

■

Sahir Nusrat
Home No: 15, Fateh Nagar
Raver - 425508 (Maharashtra)
Mob.: 7498488750

خطاب عالم شاذ

نظم

میں آم ہوں

میں آم ہوں سن مری کہانی
پھل خاص ہوں سن مری زبانی
معروف ہوں میں سبھی جگہ پر
گجرات میں میرا نام 'کیسر'
تم 'پائری' بھی وہیں کا جانو
میسور کا 'طوطا پوری' مانو
'الفونسو' نامی آم ہوں جب
امرا کا سمجھو خاص ہوں تب
'بنگنپا پلی' اے پی کا پیدا
'ہپوس' کا ہے مراٹھی شیدا
میں چھوٹا 'دسہری' یوپی کا ہوں
میں سندھ میں 'سندھڑی' بڑا ہوں
میں سبزی نہیں ہوں 'زرد آلو'
اور 'چوسہ' ہوں میں بہاری بابو

بنگال میں ہوں تو 'ہیم ساگر'
میں 'لنگڑا' ہوا وہیں پہ جاکر
میں کون ہوں؟ سونگھو، سمجھو کھاکر
میں لنگڑا ہوں، یا ہوں ہیم ساگر
میں آم ہوں سب پھلوں کا راجا
بچے، بوڑھے سب کا دل لبھاتا
دو چار مہینہ رس رسیلا
پھر شکل اچار دس مہینہ
یوں عمر ہوئی لافانی میری
اب ختم ہوئی کہانی میری

■

Khatab Alam Shaaz
Osman Manzil, H. No.: 387/1/166
Sthirpara Road West, Purbasa, Po: Kankinara
Distt: North 24 Parganas- 743126 (West Bengal)
Mob.: 8777536722

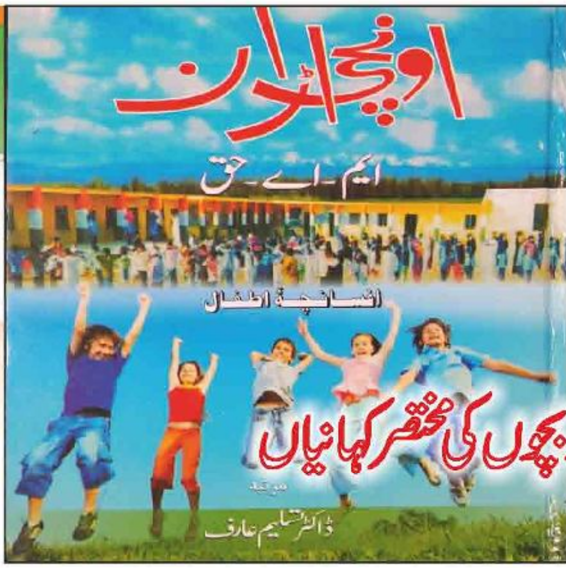

محمد علیم اسماعیل

ڈاکٹر ایم اے حق اور بچوں کی مختصر کہانیاں

ڈاکٹر ایم اے حق مشہور و معروف افسانچہ نگار تھے اور ساتھ ہی وہ بچوں کے ادیب بھی تھے۔ان کا اصل نام محمد ابرارالحق اور والد کا نام محمد انوارالحق تھا۔ والد پیشے سے ایڈوکیٹ تھے۔ ڈاکٹر ایم اے حق 15 اپریل 1950 میں محلّہ دوہانی ضلع دمکا (جھارکھنڈ) میں پیدا ہوئے۔ 1978 میں لیبر سپرنٹنڈنٹ کے عہدے پر فائز ہوئے اور 2010 میں لیبر کمشنر کی حیثیت سے سبکدوش ہوئے۔ ان کی مطبوعہ کتابوں میں، 'نئی صبح' 2007 (افسانچوں کا مجموعہ)، 'ڈنک' 2018 (افسانچوں کا مجموعہ)، 'اونچی اڑان' 2020 (افسانچۂ اطفال کا مجموعہ) شامل ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی افسانچے لکھے۔ اردو کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہندی زبان میں بھی افسانچے لکھے ہیں۔ سنہ 2009 میں ان کے ہندی افسانچوں کا مجموعہ 'بے چینی' شائع ہوا۔ ابتدا میں انھوں نے بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں جو ماہنامہ بچپن بریلی، ماہنامہ ٹافی لکھنؤ، ماہنامہ نونہال ٹائمس ممبئی اور ماہنامہ اردو کومک مالیگاؤں میں شائع ہوئیں۔ ڈاکٹر ایم اے حق 1963 سے 1967 تک ادبِ اطفال سے جڑے رہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی پہلی کہانی کا عنوان 'خواب' تھا جو 1964 میں ماہنامہ بچپن بریلی میں شائع ہوئی تھی۔

ڈاکٹر ایم اے حق نے پڑھائی کے دوران ہی اپنے بڑے بھائی اسرارالحق سے چھپ چھپا کر کہانیاں لکھنے کی شروعات کر دی تھی لیکن ان کی بھابھی اس راز سے واقف تھی اور ان کی ہمت افزائی بھی کیا کرتی تھی۔ بڑے بھائی چاہتے تھے کہ وہ پہلے اپنی پڑھائی مکمل کر لیں۔ ڈاکٹر ایم اے حق کی باقاعدہ ادبی زندگی کا آغاز 1962 میں مضمون 'پھول اور کانٹے' سے ہوا۔ پہلا افسانہ 'فٹ پاتھ کے گوشے میں' 1968 میں خاتون مشرق میں شائع ہوا۔ ماہنامہ شمع میں تواتر سے شائع ہو رہے بشیر مالیر کوٹلوی کے افسانچوں سے متاثر ہو کر وہ افسانچے لکھنے لگے۔ ان کا ادبی سفر دھیمی رفتار سے طے ہو رہا تھا اسی دوران ان کا تبادلہ بھاگلپور ہو گیا اور وہاں ان کی ملاقات پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی سے ہوئی اس کے بعد ان کے ادبی سفر کو رفتار مل گئی۔ مئی 2015 سے وہ دوبارہ بچوں کے ادب کی جانب متوجہ ہوئے اور افسانچے کی طرز پر انھوں نے بچوں کے لیے مختصر کہانیاں لکھنے کی شروعات کی جسے انھوں نے ایک نئی صنف 'افسانچۂ اطفال' کا نام دیا۔ ڈاکٹر ایم اے حق

رانچی (جھارکھنڈ) سے رسالہ 'عالمی انوارِ تخلیق' بھی نکالتے تھے جس میں دیگر تخلیقات کے ساتھ ساتھ بچوں کی کہانیاں (افسانچۂ اطفال) بھی شائع ہوتی تھیں۔

عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ شاعر و ادیب کے ادبی سفر کی ابتدا بچوں کے ادب سے ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ایم اے حق ایک ایسے ادیب ہیں جن کے ادبی سفر کی ابتدا تو بچوں کے ادب سے ہوئی لیکن ان کے ادبی اور زندگی کے سفر کا اختتام بھی ادبِ اطفال پر ہی ہوا۔ ان کی آخری کتاب 'اونچی اڑان' بچوں کے لیے لکھے گئے افسانچوں کا مجموعہ ہے جو سنہ 2020 میں منظرِ عام پر آئی اور مئی 2021 میں کورونا وائرس کے سبب ڈاکٹر ایم اے حق اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ کتاب 'اونچی اڑان' کو ڈاکٹر تسلیم عارف نے ترتیب دیا ہے جس میں کُل 66 مختصر بچوں کی کہانیاں شامل ہیں۔

ڈاکٹر ایم اے حق کو ادبِ اطفال میں مختصر اور ذہانت سے بھرپور کہانیوں کی کمی کا احساس ہوا۔ انھوں نے ایسی کہانیوں کی ضرورت کو محسوس کیا جو پہاڑ، ندی، جنگل، تو تا مینا، جن، بھوت پریت سے ہٹ کر ہوں، جو سائنسی نقطۂ نظر کو پروان چڑھائے جو دلچسپ بھی ہو اور معلوماتی بھی۔ اس کے علاوہ اور بھی کئی مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے انھوں نے بچوں کے لیے افسانچے کی طرز پر مختصر کہانیاں لکھیں۔

اس موضوع پر بات کرتے ہوئے ماہنامہ شاعر ممبئی کے مدیر افتخار امام صدیقی فرماتے ہیں "دورِ حاضر کے بچے اب کافی ذہین ہو گئے ہیں۔ ان میں کسی چیز کو سمجھنے کی لیاقت میں بے انتہا اضافہ ہوا ہے۔ ادبِ اطفال میں شائع بیشتر کہانیاں ان کے ذوق کی تسکین نہیں کر پاتی ہیں۔ راجا رانی، دیو، پری، جنگل، پہاڑ و علاالدین کے چراغ نما کہانیاں اب صرف بہت چھوٹے بچوں تک ہی محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔ موجودہ دور میں بچوں میں خود اعتمادی پیدا کرنے، انھیں اسمارٹ بنانے، انھیں ناگہانی حادثات سے محفوظ رکھنے، ملک و قوم کی ترقی میں ایک ذمے دار شہری کا رول ادا کرنے کے لائق بنانے، قدم قدم پر پرخطر راہوں سے آگاہ کرنے، ان میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا جذبہ پیدا کرنے کی اشد ضرورت کا احساس عالمی شہرت یافتہ افسانچہ نگار ڈاکٹر ایم اے حق کو ہوا اور موصوف نے ایک نئی صنف 'افسانچۂ اطفال' کی بنیاد ڈال دی ہے۔"

آیئے!! ڈاکٹر ایم اے حق کی بچوں کے لیے لکھی گئیں چند مختصر کہانیاں دیکھتے ہیں:

(1) نصیحت

"ٹکٹ؟"

نو سالہ پرویز نے پچاس کا نوٹ کنڈکٹر کی جانب بڑھا دیا۔ کرائے کے دس روپے کاٹ کر اس نے غلطی سے 90 روپے واپس کر دیے۔

پہلے تو وہ کچھ ٹھٹکا، پھر بڑی خاموشی سے اس نے رقم اپنی جیب میں رکھ لی۔ دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ وہ نانی کے گھر پہنچ کر خوب موج مستی کرے گا۔ اپنے کزن برادرس کے ساتھ فلمیں دیکھے گا۔ اس کی نانی جامن بڑے شوق سے کھاتی تھی۔ بس سے اتر کر اس نے ایک کلو جامن لیے۔

"ارے... یہ کیا ہوا؟ میرا پرس؟" پیسے دینے کے لیے پاکٹ میں ہاتھ ڈالتے ہی بے اختیار اس کے منہ سے نکلا......

اس کے پرس میں اس وقت کل ایک سو نوے روپے تھے۔

(2) احساس

کمیشن کا رزلٹ دیکھ کر ارشد کا دل خوشی سے جھوم اٹھا۔ اسے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن سپرنٹنڈنٹ کا عہدہ ملا تھا۔ اس نے مٹھائی کے دو ڈبے لیے اور گھر کی مخالف جانب جانے لگا۔ یہ دیکھ کر اس کے دوست اصغر نے پوچھا "یہ تم کہاں جا

رہے ہو؟''

''سدرشن سر کے پاس''

''کون سدرشن سر؟ وہی نا جو پرائمری اسکول میں ہمارے کلاس ٹیچر ہوا کرتے تھے۔''

''ہاں...... ہاں...... وہی''

''تو اس نوکری سے ان کا کیا تعلق؟ ویسے بھی وہ تو تم کو کافی پیٹتے تھے۔''

''تم بالکل صحیح کہہ رہے ہو۔ وہ امتحان میں نقل کے سخت خلاف تھے۔ اس وجہ سے میں نے ان سے خوب مار کھائی تھی۔ پھر بعد میں میں نے نقل سے توبہ ہی کر لی۔ اسی کا نتیجہ میری یہ کامیابی ہے۔''

(3) نہلے پر دہلا

کلاس کی گھنٹی بج چکی تھی لیکن اس کے باوجود کیمسٹری کے ٹیچر پڑھانے نہیں آئے تھے۔ ان کی اس عادت سے ذہین اور سنجیدہ لڑکوں میں کافی ناراضگی تھی۔ آج عادل سے نہیں رہا گیا۔ وہ فیصلہ کن انداز میں اُٹھا اور کلاس سے باہر جانے لگا۔

''کہاں جا رہے ہو؟'' اس کے ساتھ بیٹھنے والے ہم جماعت صوفی نے پوچھا۔ ''کیمسٹری ٹیچر کو کلاس میں لانے کے لیے'' اس نے دھیرے سے کہا اور بڑی تیزی سے کلاس سے نکل گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ واپس لوٹ آیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ابھی دس منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ کیمسٹری ٹیچر ہانپتے کانپتے کلاس میں داخل ہوئے اور بچوں کو پڑھانے لگے۔ بعد میں صوفی کے پوچھنے پر عادل نے بتایا کہ اس نے باتھ روم میں جا کر اپنے انکل کو پرنسپل کا نمبر دیتے ہوئے ساری تفصیل فون پر بتا دی تھی۔

{تعارف دسمبر 2021 کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے}

■

Mohd Alim Ismail
Ward No.: 15, Behind Police Station
Nandura - 443404 (Maharashtra)
Mob.: 8275047415

بانو سرتاج

اصلی سونا

چین کے ایک گاؤں میں نوجوان میاں بیوی خوشی خوشی دن گزار رہے تھے۔ میاں کا نام ٹونگ اور بیوی کا نام تھا سونگ سائی(Song Sai)۔

ان کے پاس قابل کاشت کافی زمین تھی۔ وہ بہت زیادہ مالدار نہیں تھے مگر خوشحال تھے۔ کسی کے محتاج نہیں تھے۔ کھاپی کر خوش رہتے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا؟ ٹونگ کے سر میں سونا بنانے کا سودا سما گیا۔ وہ تانبے کو سونے میں بدلنے کے خواب دیکھنے لگا۔ جھاڑ پھونک کرنے والوں، حکیم، ویدوں کی صحبت میں رہنے لگا۔ الٹے سیدھے تجربے کرنے لگا۔ اس شوق کے پیچھے پانی کی طرح پیسے بہانے لگا۔ پانچ چھ سال یوں ہی گزر گئے۔

سائی سمجھا سمجھا کر تھک گئی مگر ٹونگ کو عقل نہ آئی۔ آخر تنگ آکر وہ اپنے ابا کے پاس چلی گئی۔ انھیں ٹونگ کے جنون کے بارے میں بتایا وہ بوڑھے آدمی تھے، دنیا دیکھے ہوئے تھے۔ انھوں نے بیٹی سے کہا:

”تم گھر واپس جاؤ اور ٹونگ کو میرے پاس بھیج دو۔ میں اسے سمجھاتا ہوں۔“

”سائی واپس اپنے گھر لوٹ گئی اور ٹونگ کو اپنے ابا سے ملنے کو بھیج دیا۔ داماد جی! میں نے سنا ہے آپ تانبے سے سونا بنانا سیکھنا چاہتے ہیں۔“ انھوں نے پوچھا تو ٹونگ بھڑک گیا ”آپ کو کس نے بتایا؟ یقیناً آپ کی بیٹی نے بتایا ہوگا۔ وہ ہمیشہ میرے پیچھے پڑی رہتی ہے کہ یہ کرو وہ نہ کرو۔“ ”بس کرو داماد جی!“ بوڑھے سسر نے اسے روک دیا پر سمجھانے لگے ”یہ صحیح ہے کہ سائی بیٹی نے ہی مجھے بتایا ہے مگر داماد جی۔ عورتیں سب ایسی ہی ہوتی ہیں۔ وہ وقتی فائدہ دیکھتی ہیں۔ مستقبل کے بارے میں کم سوچتی ہیں۔ خیر چھوڑو۔ اتنے سالوں میں تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا کہ تم سونا بنانا چاہتے ہو... میں تو سونا بنانا جانتا ہوں۔“

”آپ سونا بنانا جانتے ہیں؟“ ٹونگ نے حیرت سے پوچھا۔

”میں نے گیارہ سال اس موضوع پر محنت کی ہے۔ علم تو حاصل ہوگیا مگر اب میں بوڑھا ہو چکا ہوں۔ مجھ سے کام نہیں ہوتا۔“

”سسر جی! مجھے بتائیے، مجھے سکھائیے۔ میں دن رات محنت کروں گا۔“ ٹونگ نے جوش میں کہا۔

”میرے پاس تمام سامان جڑی بوٹیاں موجود ہیں۔ صرف ایک پاؤڈر نہیں ہے۔ اور وہی سب سے زیادہ اہم ہے۔“

”جلدی بتائیے کون سا پاؤڈر؟ کہاں ملے گا؟“

”تمھارے کھیتوں میں ملے گا مگر یہ ضروری ہے کہ پیڑ تم خود لگاؤ، دیکھ بھال کر خود کرو، پاؤڈر خود جمع کرو۔“

”کروں گا سب کروں گا۔ آپ بتائیں تو کون سا پاؤڈر؟ کس پیڑ سے حاصل ہوگا؟“ ٹونگ کی بے صبری دیکھنے

کے قابل تھی۔

''کیلے کے پتوں پر پیدا ہونے والا سفید پاؤڈر... اور وہ چٹکی بھر یا مٹھی بھر نہیں بلکہ دو کلو چاہیے۔ جیسے جیسے سونا حاصل ہوگا پاؤڈر کی مقدار بڑھتی جائے گی۔''

ٹونگ نے سسر جی کا شکریہ ادا کر کے جو بھاگا تو گھر جا کر دم لیا۔ سونگ سائی سے پورا واقعہ بتایا تو وہ بھی خوش ہوگئی۔

ٹونگ نے اپنی ساری دولت زمین خریدنے میں لگا دی۔ کھیتوں میں کیلے کے پیڑ لگا دیے۔ سارا کام سونگ سائی دیکھتی جب کہ ٹونگ کا سارا دھیان کیلے کے پتوں کو محفوظ رکھنے پر رہتا۔ سائی ہی مزدوروں سے زمین ٹھیک کراتی، کھاد دیتی، کیلے تڑوا کر مارکٹ میں بھیجتی۔

تین سال ہوگئے۔ کیلے کے باغ تین گنا زیادہ ہوگئے۔ فصل اتنی زیادہ ہونے لگی کہ گاڑیوں میں بھر بھر کر ہاٹ بھیجنا مشکل ہوگیا۔ سائی آخر کھیتوں کے قریب ہی ہاٹ لگانے لگی۔

ادھر پیسہ برس رہا تھا، ادھر ٹونگ پاؤڈر جمع کرنے میں لگا ہوا تھا۔ آخر ایک دن مقررہ مقدار میں پاؤڈر جمع ہوگیا۔ ٹونگ سسر جی کے پاس پہنچا اور پاؤڈر کا پیکٹ ان کے سامنے رکھ دیا۔

''یہ کیا ہے؟'' سسر جی نے بے تعلقی سے پوچھا۔

''کیلے کا پاؤڈر۔ پورے دو کلو ہے۔'' ٹونگ نے جوش میں کہا۔

''اس کا میں کیا کروں گا؟''

''آپ اور میں مل کر سونا بنائیں گے اور کیا؟'' ٹونگ گڑبڑا گیا۔

''سونا! تمھیں سونے کی کیا ضرورت ہے؟ تم تو کروڑپتی بن گئے ہو۔ پورے مارکٹ میں تمھارا ہی نام ہے۔'' بوڑھے سسر نے سنجیدگی سے کہا۔

''مگر سونا، سونا ہوتا ہے سسر جی! مجھے سونا چاہیے۔'' ٹونگ نے ضدی بچے کی طرح کہا۔

''اچھا تو لو، سونا لو۔'' انھوں نے اندر کی طرف منہ کر کے پکارا، ''بیٹی سائی، سونا لے کر تو آؤ''

''سونگ سائی یہاں کب آئی؟'' ٹونگ نے دانت پر دانت جما کر پوچھا۔

سسر جی نے کوئی جواب نہ دیا۔

سائی ایک بڑا گٹھر ہاتھ میں اٹھائے آئی۔ زمین پر رکھ کر گٹھر کھول دیا۔ گٹھری میں ڈھیروں سونے کے سکے اور زیوارت رکھے ہوئے تھے۔

ٹونگ ہونقوں کی طرح باپ بیٹی کو دیکھ رہا تھا۔

بوڑھے سسر نے ہنس کر کہا ''داماد جی! چار سالوں میں تم نے صرف 2 کلو پاؤڈر جمع کیا اور تمھاری بیوی کیلوں کی آمدنی سے سونا خریدتی گئی۔ تم نے صرف پتوں کا خیال رکھا، محنت تو سائی نے کی۔ اسے سونے کی ہوس نہیں تھی مگر تمھاری خواہش پوری کرنے کے لیے اس نے محنت کی۔ اب بتاؤ سونا کس نے بنایا؟ تم نے یا سائی نے؛''

ٹونگ نے شرمندگی سے سر جھکا لیا۔

''میرے نادان داماد جی! اب بھی سنبھل جاؤ تمھارے سامنے رکھا یہ سونا اصلی سونا نہیں ہے۔ اصلی سونا تو وہ محنت ہے جو میری بیٹی نے کی ہے۔ فارمولوں اور تجربوں سے سونا نہیں بنتا، سونا محنت سے بنتا ہے۔''

(چینی کہانی کا ترجمہ)

{تعارف اپریل 2022 کے شمارے میں ملاحظہ فرمائیں}

■

Dr. Bano Sartaj Kazi
Sartaj House, Jindran Nagar
Near 1st MSEB Tower
Pandharkawada Road
Yavatmal - 445001 (MS)

سید تنویر احمد زاہدی

پرندوں کی محبت

درخشاں کو پیڑ پودے اور پرندے بہت پسند تھے۔ اس کے چھوٹے سے پکے مکان کے ارد گرد کئی اقسام کے درخت اور جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں۔ ان پر مختلف رنگوں کے پھول کھل کے ماحول کو رنگین بنا رہے تھے۔ زمین پر گھاس کا مخملی فرش بچھا ہوا تھا۔ صبح سویرے اس کی آنکھ پرندوں کی خوبصورت اور دلکش چہکاروں سے کھلتی تھی۔ کوئل، بلبل، مینا، پپیہے جب اپنی سریلی آواز میں چہکارتے تو اس کے کانوں کو بڑا بھلا لگتا۔ وہ اپنا ناشتہ لے کر مکان کے باہر نیم کے درخت کی گھنی چھاؤں میں گھاس پر بیٹھ جاتی۔ یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ وہ دن کا زیادہ تر وقت اسی جگہ گزارتی تھی۔ اس نے بڑی محنت سے اس جگہ کو سجایا سنوارا تھا۔ مختلف اقسام کے پھولوں کے پودے لگائے تھے۔ یہ پودے ہمیشہ خوشبودار پھولوں سے لدے رہتے تھے اور اپنی بھینی بھینی خوشبو بکھیر کر پورے علاقے کو معطر کیے رکھتے تھے۔ سورج غروب ہونے اور اندھیرا پھیل جانے کے بعد رات کی رانی پر بہار آجاتی۔ سفید سفید پھولوں سے پورا پودا لد جاتا۔ یہ پھول رات بھر اپنی خوشبو پھیلاتے رہتے تھے۔ رات میں وہ کچھ دیر وہاں کرسی بچھا کے بیٹھتی اور خوشگوار ماحول سے لطف لیتی۔ اسے یہ جگہ اتنی پسند تھی کہ وہ صبح کا ناشتہ اور دن کا کھانا اسی جگہ بیٹھ کے کھاتی تھی۔ کھانے میں اس کے ساتھ معصوم پرندے بھی شریک ہوجاتے تھے۔ درخشاں کو دیکھتے ہی وہ اڑ کر اس کے قریب آجاتے اور اپنی سریلی آواز میں جلدی جلدی بولنے لگتے جیسے وہ سلام کر رہے ہوں اور خیریت دریافت کر رہے ہوں۔ درخشاں ایک روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کرتی اور انہیں پرندوں کے سامنے ڈال دیتی۔ پرندے ان ٹکڑوں پر ٹوٹ پڑتے۔ درخشاں پرندوں کے ساتھ مل کر ناشتہ کرتی۔ پانی اور چائے میں بھی ان کو شریک کر لیتی تھی۔ پرندے پیٹ بھر جانے کے بعد اس کے ارد گرد پھیل جاتے تھے کوئی اس کی گود میں آبیٹھتا تو کوئی سر پر بیٹھ جاتا۔ درخشاں باری باری سب کو پیار کرتی۔ ان کے جسموں پر محبت سے ہاتھ پھیرتی اور ان کا خوب خیال رکھتی تھی۔ دس بجتے ہی وہ قریبی اسکول میں پڑھنے چلی جاتی۔ پرندے بھی اس کے ساتھ ہوتے۔ جب تک وہ اسکول میں رہتی، پرندے اسکول کے

پاس اگے درختوں، پودوں اور دیواروں پر بیٹھ کے نغمے گاتے رہتے اور اپنی دلکش چہکار سے سب کا دل بہلاتے رہتے تھے۔ اسکول میں چھٹی ہوتی تو درخشاں کے ساتھ پرندے بھی اپنی جگہ واپس لوٹ آتے اور خوب خوشی کا اظہار کرتے تھے۔ دن کے کھانے میں ایک بار پھر سب شریک ہوتے تھے۔ پرندے بھی پکے ہوئے کھانے سے لطف اندوز ہوتے۔ شام ہوتے ہی پرندے آرام کے لیے اپنے آشیانوں میں چلے جاتے۔ اور صبح ہوتے ہی پھر یکجا ہوجاتے تھے۔ شب و روز بڑی ہنسی خوشی میں گزر رہے تھے۔

ایک بار برسات میں بارش نہیں ہوئی۔ ہر طرف سوکھا پڑ گیا۔ زمین پھٹ گئی۔ پیڑ پودے جل گئے۔ گھاس مرجھا گئی۔ پرندوں کو دانہ پانی ملنا دشوار ہوگیا۔ پرندے بھوک اور پیاس سے پریشان ہوکے کسی دور دراز علاقے میں چلے گئے۔ جو علاقہ چند دنوں پہلے تک ہرا بھرا اور چرندوں اور پرندوں سے آباد تھا، اب اجاڑ اور بنجر ہوگیا۔ وہ درخت بھی سوکھ گیا جس کی چھاؤں میں بیٹھ کے درخشاں پرندوں کے ساتھ کھیلتی تھی۔ اپنے ننھے دوست پرندوں کی غیر موجودگی میں اب اس کا دل بھی اس جگہ نہیں لگتا تھا۔ وہ اس جگہ جانا چاہتی تھی جہاں اس کے دوست پرندے موجود تھے۔ لیکن وہ اپنے گھر والوں کو چھوڑ کر کہاں جاتی۔ اس کی مغموم متلاشی آنکھیں پرندوں کی تلاش میں بھٹکتی رہتیں۔ وہ ان کی غیر موجودگی میں اداس رہنے لگی۔

درخشاں کے والد شہر کے ایک اسکول میں ٹیچر تھے۔ چھٹی ملتی تو وہ بال بچوں سے ملنے کے لیے گھر آجاتے تھے۔ درخشاں کے والد اس بار چھٹی میں گھر آئے تو اپنے ساتھ کھانے پینے کا بہت سا سامان اور غلہ وغیرہ لائے۔ انھیں معلوم ہوگیا تھا کہ ان کے علاقے میں قحط سالی کے آثار ہیں۔ کھیتی باڑی نہیں ہوئی ہے۔ درختوں پر پھل نہیں لگے ہیں۔ کھانے پینے کی اشیا مہنگی ہوگئی ہیں اور آسانی سے دستیاب بھی نہیں ہیں۔ بازار بھی اناج سے خالی پڑے ہیں۔ ان کے آنے سے گھر میں رونق آگئی تھی۔ گھر میں اس قدر غلے تھے کہ چھ مہینے تو بے فکری سے گزر جاتے۔ اپنے والد کی آمد پر اسے خوشی تو تھی لیکن پرندوں کی غیر موجودگی نے اسے فکرمند بھی بنا دیا

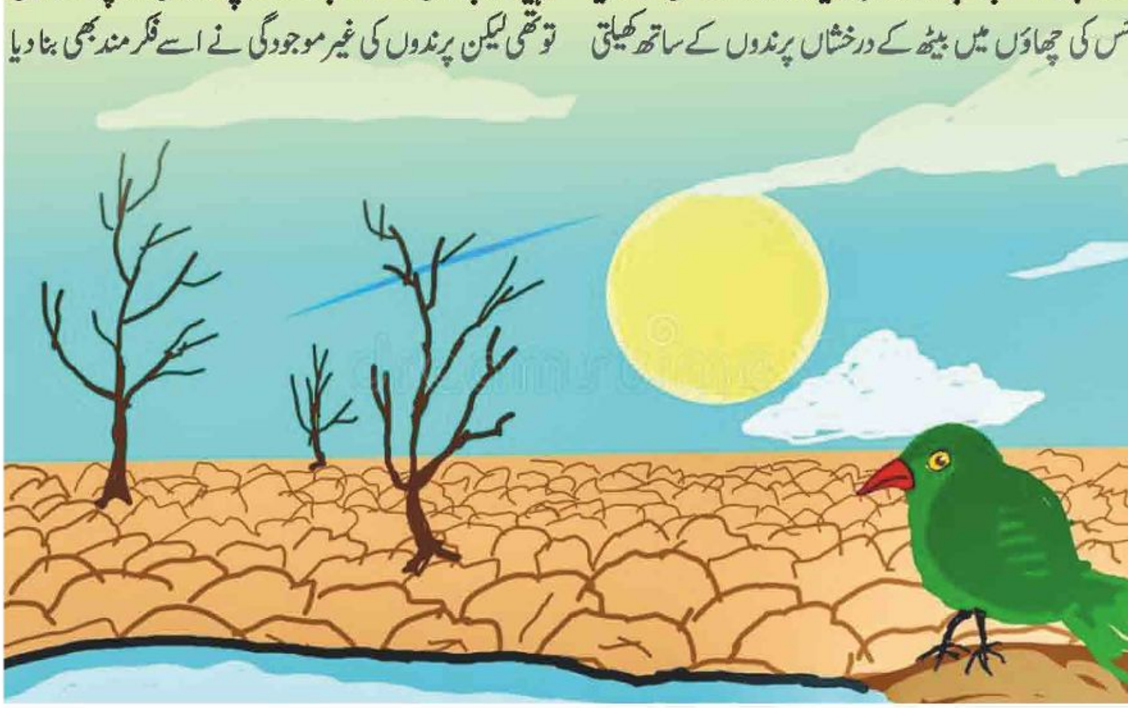

تھا۔ ان کے بغیر اسے زندگی گزارنا دشوار ہوگیا تھا۔ اس کے دوست پرندے کبھی کبھی اڑ کے اس کے پاس آجاتے تھے اور تھوڑی دیر اس کے ساتھ رہ کر غذا کی تلاش میں دور دور نکل جاتے۔ درخشاں کو اپنے ان معصوم دوستوں کی محبت ہر وقت بے چین کیے رکھتی تھی۔ ایک دن اس نے اپنے والد سے مشورہ کیا کہ پرندوں کو کیسے واپس لایا جائے۔ والد نے کہا کہ کھانے پینے کا یہاں انتظام ہوجائے تو ان پرندوں کو دور جانے کی مشقت نہیں اٹھانی پڑے گی۔ ایک دن انھوں نے نیم کے درخت کی جڑ کے پاس مٹی کے دو برتن رکھ دیے۔ ایک برتن میں چاول ڈال دیے اور دوسرے برتن کو کنویں کے پانی سے لبالب بھر دیا۔ درخشاں کو خوشی ہونے لگی کہ بھوکے پرندوں کے کھانے پینے کا انتظام ہوگیا ہے۔ اب وہ اس کے پاس لوٹ آئیں گے اور سب پیار محبت کے ساتھ مل کر رہیں گے۔ لیکن دو دن تک کوئی پرندہ اس جگہ نہیں آیا۔ وہ غذا کی تلاش میں کہیں دور چلے گئے تھے۔ تیسرے دن ایک مینا پھڑ پھڑاتی ہوئی آئی اور اس کے قریب زمین پر گر گئی۔ اس مینا سے درخشاں کو بڑی محبت تھی۔ مینا بھوک پیاس سے نڈھال ہو رہی تھی۔ شاید کئی دنوں سے اسے کھانے کو کچھ نہیں ملا تھا۔ درخشاں نے اسے پیار سے اٹھایا۔ اس کے جسم پر لگی مٹی جھاڑی اور چاول کے برتن پر بیٹھا دیا۔ مینا جلدی جلدی چاول کھانے لگی۔ پیٹ بھر کر اس نے چاول کھائے۔ چاول کھا کے اس نے پانی پیا اور پروں میں منہ چھپا کے لیٹ گئی۔ اس پر غنودگی طاری تھی۔ درخشاں اس کے جسم پر محبت سے ہاتھ پھیرتی رہی۔ ایک گھنٹے بعد جب مینا کے جسم میں کچھ توانائی آئی تو وہ درخشاں کے کندھے پر بیٹھ کر پیار بھری آواز نکالنے لگی اور پھر اڑ کے وہاں سے کہیں دور چلی گئی۔ درخشاں اسے جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ تھوڑی دیر گزری تھی کہ درجنوں پرندے وہاں آموجود ہوئے، ان کے ہمراہ مینا بھی تھی۔ سب چاول کھانے اور پانی پینے لگے۔ کافی دنوں کے بعد انھیں کھانا پانی ملا تھا۔ وہ اس کے لیے درخشاں کے شکر گزار تھے۔ انھیں اپنی پرانی جگہ بہت پسند تھی۔ لہٰذا پرندوں نے اسی جگہ دوبارہ رہنا شروع کر دیا۔ درخشاں ہر روز ان کے کھانے پینے کا انتظام کر دیتی تھی۔ پرندوں کا جب پیٹ بھر جاتا تو وہ میٹھی آواز میں اللہ کی حمد و ثنا کرنے لگتے۔ اسی دوران موسم نے رنگ بدلا۔ بادل گھر کر آئے اور خوب جم کر بارش ہوئی۔ پورا علاقہ جل تھل ہوگیا۔ سوکھے درخت ہرے بھرے ہوگئے۔ بنجر زمین سبز مخملی گھاس سے ڈھک گئی۔ درختوں پر پھول پھل لگ گئے اور زمین غلے اگلنے لگی۔ زندگی پرانی ڈگر پر لوٹ آئی تھی۔ درخشاں اپنے دوست پرندوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہنے لگی۔

بچو! ہم جس جگہ رہتے ہیں وہ ماحول کہلاتا ہے۔ ماحول صرف انسانوں سے نہیں بنتا بلکہ انسان کے ساتھ جانوروں، پرندوں، پیڑ پودوں، تالاب اور پانی کے ذخیروں سے مل کر بنتا ہے۔ ماحول کی بہتری کے لیے ضروری ہے کہ ہم سب کا خیال رکھیں۔ پیڑ پودے اور جانور ماحول کا حصہ ہیں۔ ان کا تحفظ ضروری ہے۔ ان کی موجودگی سے ہمارا ماحول ہرا بھرا اور صحت مند رہتا ہے۔ تازہ ہوا، آکسیجن اور پانی کے لیے ہم ماحول کے محتاج ہیں۔ ہمیں ایسا کوئی کام نہیں کرنا چاہیے جس سے ہمارے اردگرد کے ماحول کو نقصان پہنچے اور ہماری زندگی خطرے میں پڑ جائے۔

{تعارف اپریل 2022 کے شمارے میں شائع ہوچکا ھے}

■

Syed Tanveer Ahmed Zahedi
40/1, Jannagar Road
Kolkata - 700017 (Kolkata)
Mobile : 9038819780
Email : tanveerzahedi@gmail.com

کہانی

مدد کرو کمپیوٹر

ذاکر علی رجنیش

ڈاکٹر ذاکر علی تعلق لکھنؤ سے ہے۔انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ہندی میں ایم اے اور آگرہ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ہے۔فی الحال منڈی پریشد لکھنؤ سے وابستہ ہیں۔گذشتہ 20 برسوں سے بچوں کے لیے ہندی اور اردو دونوں زبانوں میں کہانیاں لکھ رہے ہیں۔ان کی تخلیقات سائنس کی دنیا، امنگ اور دیگر اخبارات میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ اردو میں بچوں کی کہانیوں کی ایک کتاب 'سب سے بڑا انعام' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔ہندی میں 67 کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔انھیں بہت سے اعزازات بھی مل چکے ہیں۔سائنس اینڈ ٹیکنالوجی ڈپارٹمنٹ حکومت ہند سے نیشنل سائنس ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔

کال بیل کی آواز سن کر اہل دروازے کی طرف دوڑا۔اسے پورا یقین تھا کہ پاپا ہی ہوں گے۔آفس سے انھوں نے آج جلدی چھٹی لے لی تھی۔آخر آج اس کا برتھ ڈے جو تھا۔صبح سے امی پاپا اس کے کمرے کو سجانے میں لگے تھے کہ رنگ برنگی جھنڈیاں، جھالریں، غبارے اور بھی نہ جانے کیا کیا۔آج اہل کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔اس نے اپنے برتھ ڈے پر اپنے سبھی دوستوں کو دعوت دی تھی۔شام کو سات بجے کیک کاٹا جانا تھا۔ پاپا کیک لینے کے لیے ہی بازار کو نکلے تھے۔ضرور دروازے پر پاپا ہی ہوں گے۔اس نے سوچا اور ایک جھٹکے میں دروازہ کھول دیا۔ پر یہ کیا؟ باہر کا نظارہ دیکھ کر اہل کے ہوش اڑ گئے۔ باہر غنڈے جیسی شکل کے تین آدمی کھڑے تھے۔اس کے ہاتھ میں چھرے چمچمار ہے تھے۔ان لوگوں نے اہل کو دھکا دیا اور اندر آنے کے بعد دروازہ بند کر دیا۔اہل ایک دم گھبرا گیا۔اس کے منھ سے آواز تک نہ نکلی۔تبھی اہل کی امی وہاں آگئیں۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتیں، غنڈوں نے چاقو ان کے گلے سے لگا دیا اور گرج کر بولے، خبردار، اگر کسی نے آواز کی۔ چلو، مال نکالو، مال!''

''کون ہو تم لوگ؟ اہل کی امی نے پوچھنا چاہا، کیا چاہتے ہو...''

''اے چپ! فوراً تجوری کی چابی نکالو، ورنہ...'' ایک بدمعاش نے انھیں آنکھیں دکھائیں۔اب تک بارہ خون کر چکا ہوں۔تیرہواں کرنے میں مجھے کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔

تبھی ایک بدمعاش، جوان لوگوں میں بڑا جان پڑتا تھا، اپنے ایک ساتھی سے بولا ''زغو، تو اس لڑکے کو سنبھال، ہم لوگ ادھر دیکھتے ہیں۔ اپنے ساتھی کا حکم سن کر زغو ان کی طرف بڑھا تبھی اہل کی امی بول اٹھیں، میرے بیٹے کو ہاتھ مت لگانا... ''

''ہاں، لیکن پہلے چابی... '' ایک بدمعاش نے بات کاٹی۔

اہل کو لے کر زغو بغل کے کمرے میں چلا گیا۔ کمرے کے بیچوں بیچ ایک میز پر کیک رکھنے کا انتظام تھا۔ ایک اور کونے میں کتاب کی الماری اور پڑھنے کی میز تھی۔ دوسری طرف میز پر ایک کمپیوٹر رکھا ہوا تھا۔

زغو نے ایک کرسی دروازے کے پاس کھینچ لی اور اس پر بیٹھتا ہوا بولا ''اے چھوکرے، چپ چاپ بیٹھ جا اور کوئی چالاکی والا کی نہیں۔ سمجھا؟ ورنہ، بہت خراب آدمی ہوں میں... ''

اہل کچھ نہیں بولا۔ وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ یہ غنڈے اس کے گھر کا سامان لوٹ رہے ہیں اور وہ مجبور ہو کر...

اچانک اہل کی نظر کمپیوٹر پر پڑی۔ تبھی اس کے دماغ کی گھنٹی بج اٹھی۔ کیوں نہ انٹرنیٹ کے ذریعے... ؟

انکل، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ کیا میں کمپیوٹر پر گیم کھیل سکتا ہوں؟ اہل نے بہت بھولے پن سے پوچھا۔

زغو اہل کی طرف دیکھ کر ہنسا ''کھیل لے منا کھیل لے'' پر چپ چاپ، سمجھا،

اہل کے چہرے پر ہلکی سی چمک آگئی۔ وہ کمپیوٹر کے آگے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا اور کمپیوٹر کو آن کر دیا۔ وقت بہت کم تھا۔ اگر کچھ ہی پلوں میں غنڈوں کو نہیں روکا گیا، تو...

کمپیوٹر اسکرین دیکھتے ہی دیکھتے جھلملا اٹھی۔ سامنے ڈیسک ٹاپ پر ہی سبھی پروگراموں کے آئیکن بنے تھے اور انھیں میں سے ایک ای میل کا آئیکان تھا ای میل، ایک ایسا پروگرام ہوتا ہے جس کے ذریعے کوئی بھی پیغام ایک آدمی سے دوسرے آدمی تک بھیجا جاتا ہے۔ یہ کام پلک جھپکتے ہی ہو جاتا ہے۔ وہاں پر اگر اسے پڑھنے والا آدمی کمپیوٹر پر موجود ہو، تو وہ اسے پڑھ کر فوراً اس کا جواب بھی دے سکتا ہے۔

ای میل آپشن کو ماؤس سے کلک کرتے ہی وہ پروگرام آن ہو گیا۔ اہل نے جلدی سے شہر کے ایس صاحب کا ای میل ایڈریس نکالا اور ان کے نام میسیج ٹائپ کرنے لگا۔

زغو کی نظریں باہر کی طرف لگی تھیں۔ اس نے ایک بار کمپیوٹر کی طرف نظر گھمائی لیکن انگریزی میں لکھا ہونے کی وجہ سے اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے کمپیوٹر سے اپنی نگاہ ہٹالی اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔

تھوڑی دیر میں زغو کو اس کے ساتھی نے آواز دی۔ وہ اہل کو لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ وہاں پر اس کے دونوں ساتھی پہلے سے تیار تھے۔ ان لوگوں نے ایک بڑی سی پوٹلی باندھ رکھی تھی۔ پوٹلی میں اہل کے پاپا کی محنت کی کمائی تھی، جسے غنڈے لوٹ کر لے جارہے تھے۔

اہل نے ڈوبتی نظروں سے اس پوٹلی کو دیکھا۔ اس کے من میں سوال کوندا، تو کیا یہ غنڈے اتنی آسانی سے اس کے گھر کا سامان اٹھا لے جائیں گے؟ اس کی ساری محنت بیکار چلی جائے گی؟

لٹیروں کا کام ختم ہو چکا تھا۔ انھوں نے ایک رسی سے اہل اور اس کی امی کو باندھ کر ان کے منھ پر ٹیپ چپکا دیا اور سامان لے کر باہر نکل گئے۔

اہل تو جیسے رو ہی پڑا۔ کیا اس کا ای میل بیکار چلا گیا؟ کیا ایس صاحب کو اس کا میسیج نہیں ملا؟ اس کا دل چاہا کہ زور زور سے روئے۔ آنگن میں جس جگہ پر ان لوگوں کو باندھا گیا تھا، وہاں سے باہر کا دروازہ ایک دم صاف دکھائی پڑتا تھا۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ اہل کا منھ اس وقت دروازے کی طرف ہی تھا۔ اس نے دیکھا کہ لٹیروں کے جانے کے کچھ ہی پلوں بعد باہر کا دروازہ پھر سے کھلا۔ اسے لگا کہ پاپا آگئے لیکن یہ کیا؟ چور پھر سے گھر کے اندر واپس آرہے تھے، لیکن اس بار ان کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں جھول رہی تھیں اور ان کے ساتھ تھے انسپکٹر کشور اور اس کے پاپا۔ یعنی کہ اہل کی چال کامیاب ہوگئی تھی، اس کا چہرہ کھل اٹھا۔

تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے پاپا اہل کے پاس آئے، انھوں نے اس کے اور امی کے ہاتھ کھول دیے۔ اس سے پہلے کہ امی کچھ کہتیں، انسپکٹر بول پڑا، تو یہ ٹنگو ماسٹر کا کمال ہے؟

آپ کس کمال کی بات کررہے ہیں انسپکٹر صاحب؟ امی نے حیران ہوکر پوچھا ''آپ کو کیسے پتہ چلا کہ ہمارے گھر میں...؟''

تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کو کچھ نہیں معلوم؟ انسپکٹر نے حیران ہوکر پوچھا۔

امی حیران تھیں۔ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ وہ بولیں ارے بھئی، میں سچ کہہ رہی ہوں کہ مجھے کچھ نہیں معلوم۔

اوہ، میں تو سمجھا تھا کہ آپ کو ساری بات معلوم ہوگی۔ انسپکٹر بولا، دراصل بات یہ ہے کہ جب یہ لٹیرے آپ کے گھر میں آئے، اسی وقت آپ کے بیٹے نے چپکے سے ایس صاحب کے پاس ای میل سے اس واردات کے متعلق بتادیا تھا۔ ایس صاحب نے ای میل پڑھتے ہی وائرلیس پر اناؤنس کروادیا اور ہم لوگ فوراً حاضر ہوگئے۔

اوہ میرے لال، امی نے خوش ہوکر اہل کو سینے سے لگالیا۔

انسپکٹر بولے، تم نے بہت چالاکی سے کام لیا بیٹے، ورنہ یہ چور اتنی آسانی سے ہاتھ نہیں آتے۔ اس کے لیے ڈی صاحب سے تمھارے لیے انعام کی سفارش کروں گا۔

انسپکٹر کی باتیں سن کر اہل نہال ہو اٹھا۔ اس کے لیے اس سے بڑا تحفہ اور کیا ہوسکتا تھا؟ اپنی سمجھداری کے بل پر اس نے اپنے گھر کی خوشیاں لٹنے سے بچالی تھیں۔ وہ بس اتنا ہی بولا ''تھینک یو انکل'' اور پھر اپنی امی سے لپٹ گیا۔

■

Zakir Ali Rajnesh
7 A/55, Vrindavan Yojna, Raibarely Road
Lucknow - 226025
Mob.: 9935923334

دوستی

عبدالرحمن شافی

ارے خالد، اتنی تیزی سے کہاں جا رہے ہو، ذرا سنبھل کر، کہیں گر مت جانا۔ بھیکو کاکا نے (جو گھاس کی گٹھری سر پر رکھے ہوئے جا رہے تھے) خالد کو دیکھ کر پوچھا۔

کاکا وہ موہن (خالد کا دوست) ہے نا، اس کی طبیعت خراب ہے، بس اسی کے پاس جا رہا ہوں۔

اچھا اچھا۔ کہہ کر وہ اپنی راہ ہو لیے۔

موہن اور خالد دونوں ہی بچپن میں یتیم ہو گئے تھے۔ زمانے کی ٹھوکروں میں گرتے پڑتے جیسے تیسے بڑے تو ہو گئے مگر والدین کی محبت سے محرومی کا اثر ان پر ہمیشہ رہا جس کی کمی انھوں نے ایک دوسرے کی دوستی سے پوری کی تھی۔ اگرچہ خالد اور موہن گاؤں کے دو مختلف کناروں پر رہتے تھے مگر یہ دوری کبھی ان کی دوستی میں رکاوٹ کا سبب نہیں بنی۔ ٹائی فائڈ کی عام وبا نے پچھلے کچھ دنوں سے موہن کو جکڑا ہوا تھا، اسی لیے خالد نے گذشتہ روز یہ ارادہ کر لیا تھا کہ وہ اسے اگلے دن ڈاکٹر کے پاس لے کر جائے گا۔

موہن او موہن!! خالد نے جھونپڑی میں گھستے ہی موہن کو آواز دی۔ موہن ایک کونے میں پڑی چارپائی پر منہ پر کپڑا ڈالے لیٹا ہوا تھا۔ بخار کی شدت کی وجہ سے اس پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی۔

موہن کے پاس پہنچ کر خالد نے جیسے ہی اس کے سر پر ہاتھ رکھا، اس کا ماتھا بخار سے تپ رہا تھا، خالد کے چھونے سے موہن کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے فوراً خالد کو آواز دی:

خالد یہ تو ہے کیا؟۔ کیونکہ موہن دیکھ نہیں سکتا تھا۔ مگر خالد کا لمس پہچانتا تھا۔

ہاں ہاں موہن، میں ہی ہوں خالد!!

تو نے کچھ کھایا بھی ہے یا بس یوں ہی خالی پیٹ یہاں پڑا ہوا ہے۔

اٹھ موہن! دیکھ میں تیرے لیے روٹی لایا ہوں۔ پہلے کچھ کھا لے، پھر ہم ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔

خالد نے موہن کے سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر اسے بٹھایا اور اپنے ہاتھ سے روٹی کھلائی۔

اب موہن پہلے سے کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔ کچھ دیر ٹھہرنے کے بعد خالد نے کہا:

چل اٹھ، ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔

موہن: مجھ میں چلنے کی ہمت نہیں یار، میں کیسے چل پاؤں گا؟ ٹانگوں میں کھڑے ہونے کی طاقت نہیں ہے۔

ارے پگلے، خدا نے بھلے ہی مجھے ایک پاؤں دیا ہو لیکن میرے پاس ایک نہیں بلکہ تین پیر ہیں۔

اچھا!! تو، تو نے دو میرے بھی گن لیے۔ ایک خفیف سی مسکراہٹ موہن کے ہونٹوں پر پھیل گئی۔

ہاں کیوں نہیں، وہ بھی تو میرے ہی ہیں، دونوں ہنس دیے۔

موہن کا ہاتھ خالد نے اپنے کندھے پر رکھا، ایک ہاتھ سے بیساکھی اور دوسرے سے موہن کی کمر پکڑ کر آہستہ آہستہ دونوں سرکاری ہسپتال کی طرف چل دیے۔

ڈاکٹر نے موہن کا اچھی طرح معائنہ کیا اور دوائی دے کر اسے آرام کرنے کی صلاح دی۔ گھر پہنچ کر خالد نے اسے سب سے پہلے دوائی دی۔ دوائی دے کر خالد موہن کے سرہانے بیٹھ گیا اور نرم ہاتھ سے اس کا سر دبانے لگا جس سے اسے کافی آرام مل رہا تھا اور پھر دونوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

دوائی سے موہن کو کافی آرام ملا، اب وہ سو چکا تھا۔ ڈاکٹر کے کہنے پر خالد موہن کے پاس ہی رک گیا، کیونکہ اسے دیکھ بھال کی ضرورت تھی۔

رات کے تیسرے پہر گاؤں میں شور اٹھا، بھاگو! بھاگو!۔

گاؤں میں ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔

موہن نے خالد کو اٹھایا:

خالد جلدی اٹھ کر دیکھ، باہر یہ شور کیسا ہے؟ لوگ کیوں چلا رہے ہیں؟

موہن کی ہڑبڑاہٹ سے خالد بھی گھبرا گیا، اس نے فوراً اپنی بیساکھی اٹھائی اور نیند کے خمار میں جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔

خالد نے دیکھا کہ گاؤں میں آگ لگ چکی ہے اور زیادہ تر جھونپڑیاں جل رہی تھیں۔ بجلی کا تار ٹوٹ کر گیہوں کے کھیتوں میں گر گیا جس کی وجہ سے کھیت جل گئے اور ہوا کا رخ گاؤں کی طرف ہونے کی وجہ سے اکثر جھونپڑیوں نے آگ پکڑ لی تھی۔ موہن کی جھونپڑی میں بھی آگ لگ چکی تھی۔ خالد مجبور تھا کہ وہ بھاگ نہیں سکتا اور موہن دیکھ نہیں سکتا تھا۔ تبھی موہن کو ایک تدبیر سوجھی اس نے خالد سے کہا:

خالد، ایک کام کر تو میرے کندھے پر بیٹھ جا اور مجھے راستہ بتا، اس مصیبت سے ہمیں اسی طرح نجات مل سکتی ہے۔ خالد نے لجاجت سے کہا۔

مگر میرے یار، تو ابھی بیماری کی وجہ سے کمزور ہے اور میرا وزن زیادہ ہے تو میرا بوجھ کیسے اٹھا سکتا ہے؟

جیسے تو آج تک میرا بوجھ اٹھاتا آیا ہے، بالکل ویسے ہی۔

مگر... خالد کچھ بولنے ہی والا تھا کہ موہن نے بیچ میں ہی اس کی بات کاٹ دی۔

یہ بحث کا وقت نہیں ہے خالد! جیسا کہتا ہوں ویسا کر۔

خالد نے ویسا ہی کیا، اس کے کندھے پر سوار ہو کر اس کو راستہ بتانے لگا۔ نہ جانے کہاں سے آج موہن میں اتنی طاقت آ گئی تھی کہ خالد کو اٹھائے وہ ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ کھیتوں کی موٹی پتلی ڈول سے گذرتے ہوئے خالد کو اپنے کندھے پر اٹھائے لیے جا رہا تھا۔

گاؤں سے باہر نکل کر دونوں نے سکون کی سانس لی کہ اب خطرہ ٹل گیا تھا، کیونکہ آگ ہار چکی تھی اور دوستی جیت گئی تھی۔

■

Abdur Rehman Shafi
H. No.: 110/75, S/F, Gali No 2, Ghaffar Manzil
Jamia Nagar, Okhla
New Delhi- 110025
Mob.: 7017903577

عابد معز

ہنستا پان بولتی چھالیہ

کہانیوں کو ہر کوئی چاہے وہ ایک سال کا بچہ ہو یا سو سال کا بوڑھا پسند کرتا ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری بھی اپنی ایک کہانی ہوتی ہے اور ہم دوسری کہانیوں کے اہم کردار بھی ہوتے ہیں۔ کہانیاں لکھنا، پڑھنا اور سنانا فنون لطیفہ کی اہم صنف ہے۔

مختلف عمروں کے لیے الگ الگ کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ نقاد کہتے ہیں کہ بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے میں مشکل ہوتی ہے۔ وہ اس لیے کہ بچوں کی کہانیوں کو بڑی عمر کے لوگ تخلیق کرتے ہیں۔ بڑی عمر میں بچوں کی طرح سوچ کر اور بچہ بن کر کہانیاں لکھنا پڑتا ہے۔ بچوں کی نفسیات سے واقفیت بھی ضروری ہوتی ہے۔ محترمہ شبینہ فرشوری بحیثیت ایک بڑی بہن، ایک ماں، ایک دادی اور ایک نانی بچوں کے عادات واطوار اور ان کی سوچ وفکر سے بخوبی واقف ہیں اور انھوں نے اپنے تجربے کو بروئے کار لاکر بچوں کی کہانیاں لکھنے کی طرف توجہ کی ہے جو بچوں کا ادب تخلیق کرنے والی فہرست میں ایک اہم اضافہ ہے۔

بچوں کے لیے لکھی جانے والی کہانیوں کو بڑے لوگ شوق سے پڑھتے ہیں۔ مختلف وجوہات ہوتی ہیں۔ کسی کو بچپن کی باتیں اب سمجھ میں آتی ہیں تو کسی کو لگتا ہے کہ وہ پھر بچے بن گئے ہیں۔ بعض بڑے لوگوں کو دیکھ کر خیال آتا ہے کہ بچپن کبھی پیچھا نہیں چھوڑتا، ہر عمر میں ساتھ رہتا ہے۔ خیر میں نے شوق سے شبینہ فرشوری کی پوری کتاب پڑھ ڈالی۔ کتاب پڑھنے کے بعد نثر کی کتاب کو شاعری میں دی جانے والی داد سے نوازنے کو جی چاہتا ہے کہ واہ واہ... بہت خوب... سبحان اللہ... کیا کہنے...

مصنفہ نے قاری بچوں کا خیال کرتے ہوئے بہت آسان زبان استعمال کی ہے اور مختصر پیرائے میں اپنی بات کو پیش کیا ہے۔ کہیں کوئی الجھن ہے اور نہ کہیں کوئی ثقل اور نہ بچوں کی عمر سے بڑا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ میرے خیال میں یہ مصنفہ کی کامیابی ہے۔

کتاب 'ہنستا پان بولتی چھالیہ' میں مختلف نوعیت کی بیس سے زیادہ کہانیاں ہیں۔ ان میں وہ روایتی کہانیاں بھی ہیں جن میں ایک پری ہوتی ہے۔ یہ پری جادو کر سکتی ہے۔ اپنی طلسماتی طاقت سے وہ اچھے لوگوں کا ساتھ دیتی اور بروں کو سبق سکھاتی ہے۔ روایتی کہانیوں میں بادشاہ سلامت بھی ہوتے ہیں۔ اس بادشاہ کے بچے شہزادے اور شہزادیاں بھی ہیں۔ بچوں کی کہانیوں کا روایتی کردار غریب ماں کا فرماں بردار بیٹا ہے تو شیخ چلی بھی ہے۔ روایتی کہانیاں ہم نے اپنے بزرگوں سے اس

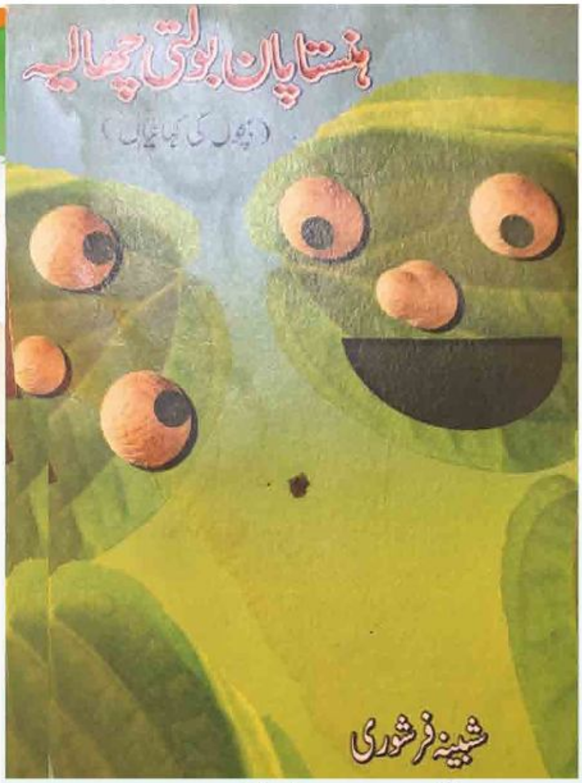

ہنستا پان بولتی چھالیہ، **مصنفہ:** شبینہ فرشوری، **صفحات:** 96،
قیمت: 150، **موبائل:** 9676399529

وقت سنی ہیں جب نہ ٹیلی ویژن تھا اور نہ ہی انٹرنیٹ۔ شبینہ فرشوری صاحبہ ان کہانیوں کو اپنی نئی نسل کو پڑھا اور سنا کر تہذیب کی منتقلی کا کام انجام دے رہی ہیں وہ قابل مبارکباد ہیں۔

کتاب میں شامل چند کہانیاں روزمرہ کے واقعات پر مبنی ہیں۔ وقت سے پہلے موٹر سائیکل چلانے کی خواہش آج کے دور کے ہر بچے میں ہوتی ہے۔ موٹر سائیکل چلانے کے واقعہ کو کہانی کا روپ دے کر کم عمری میں موٹر سائیکل سواری کے نقصانات سے آگاہ کیا گیا ہے۔ ایک دوسرے واقعہ کو بھی کہانی کا روپ دے کر پیش کیا گیا ہے جس میں شبینہ فرشوری صاحبہ کی تیسری نسل اچھا اور نیک کام کرتی ہے۔ ان کہانیوں کو پڑھنے سے یہ احساس ابھرتا ہے کہ محترمہ کو کہانیاں گڑھنے کا فن آتا ہے۔

شبینہ فرشوری صاحبہ کہانی کے ذریعے بچوں کو معلومات اور جانکاری بھی فراہم کرتی ہیں۔ موتی جیسے دانت، دیمک، باپ رے باپ سانپ اور شانی کی نانی مثالیں ہیں۔ میں شانی کی نانی کے متعلق بتانا چاہوں گا کہ اس کہانی میں بچوں میں موٹاپے کے بارے میں خاصی معلومات دی گئی ہیں۔ اس کہانی میں بہت صحیح اور دوٹوک انداز میں یہ بات بچوں اور اور بچوں کی ماؤں تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے کہ بچوں میں موٹاپے کے لیے والدین بالخصوص مائیں ذمے دار ہوتی ہیں اور یہ بھی کہ موٹاپے کا علاج گھر کے کچن میں ہوتا ہے۔

سرورق اور کتاب میں موجود اسکیچز (Illustrations) کے لیے میں مصنفہ کے فرزند فراز فرشوری کی ستائش کرنے کے ساتھ ان کو مبارکباد دینا چاہوں گا۔ پان اور چھالیہ کی مدد سے کہانی سنانے اور سننے والوں کو خوبصورت انداز اور دل خوش رنگوں میں سرورق پر پیش کیا ہے۔ اردو کی بہت کم کتابوں میں Illustratins کا سہارا لیا جاتا ہے۔ اس کی مختلف وجوہات ہوتی ہیں۔ لاگت ایک عام اور اہم وجہ ہے۔ یہاں Illustrator چونکہ گھر کا ہے اور جس نے اپنی ماں سے یہی کہانیاں سنی ہیں اپنی ماں اور مادری زبان کا حق ادا کر رہا ہے۔

ہمیں بتایا گیا ہے کہ مصنفہ نے ان کہانیوں کو پوتے، پوتیوں اور نواسیوں کو امریکہ، گلف اور ہندوستان میں پہلے سنایا ہے اور پھر کتابی شکل دی ہے۔ یہ کتاب ایک طرح سے 'فرشوری ہاوز پروڈکشن' ہے جس میں دادی اور نانی نے کہانیاں سنائی اور لکھی ہیں، بیٹے نے ان کے خاکے بنائے ہیں اور بچوں نے ان کہانیوں کو سنا ہے۔

■

Dr. Abid Moiz
8-1-21/27, Surya Nagar Colony,
Toli Chowki
Hyderabad 500 008(Telangana)
Mob.: 9502044291

اکبر خاں عرش جالوری

وائلڈ لائف

ریچھ کو بھالو بھی کہا جاتا ہے۔ بھالو آرسڈی نسل کا گوشت خور دودھیل (دودھ پلانے والا جانور) گچھے دار گھنے بالوں والا بڑا جانور ہے۔ یہ زیادہ تر منطقہ حارہ یا خط استوا کے گرم علاقے سے لے کر منطقہ باردہ یا قطب شمالی کا ٹھنڈا علاقہ جہاں ہمیشہ برف جمی رہتی ہے ایسی آب و ہوا والے ملک شمالی امریکہ اور ایشیا یورپ وغیرہ کے بڑے کرۂ ارض پر پایا جاتا ہے۔

بالوں کی لمبائی اور کھال کی چوڑائی کی وجہ سے کچھ بھالو اپنے قد سے بڑے لگتے ہیں۔ ان میں کچھ بھالو دس فٹ سے زیادہ لمبے اور 1700 پونڈ تک وزن والے ہوتے ہیں۔

ان کے پاؤں چھوٹے اور مضبوط ہوتے ہیں۔ پنجے لمبے اور بہت وزن دار ہوتے ہیں جن میں پانچ بڑے بڑے ناخن ہوتے ہیں۔ یہ اپنے ناخنوں کا استعمال نوچنے، زمین کھودنے اور پہاڑوں اور پیڑوں پر چڑھنے کے لیے کرتے ہیں۔ زمین پر بھالو کتوں اور بلیوں کی طرح پاؤں کی انگلیوں پر نہیں چلتا پھر بھی یہ چکنی اور کھردری دونوں قسم کی زمین پر تیزی سے دوڑ سکتا ہے۔ کئی طرح کے بھالو تو پیڑوں پر بھی تیزی اور ہوشیاری سے چڑھ سکتے ہیں۔ سردیوں میں یہ زیادہ تر گہری نیند میں سوئے رہتے ہیں۔

گوشت خور شکاری جانور ہوتے ہوئے بھی یہ کئی طرح کا کھانا کھا سکتے ہیں کیونکہ ان کے دانتوں کی مخصوص بناوٹ سے ان کو چبانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ ویسے اس کی خاص غذا مچھلیاں، پھل، چڑیوں کے انڈے، میمنے، سوروں کے بچے، بیر، کٹہل، پودوں کی جڑیں اور پتیاں ہیں۔ ان کو شہد بہت زیادہ پسند ہے۔ شہد کی مکھیاں بڑے بڑے بالوں کی وجہ سے انھیں کاٹ نہیں پاتی ہیں۔ اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھوں سے یہ دیکھ کم پاتے ہیں، لیکن ان کی قوت سماعت اور قوت شامہ (سننے اور سونگھنے کی طاقت) تیز ہوتی ہے۔ سردیوں کے آخر میں مادہ بھالو ایک یا دو بچے دیتی ہے۔ سردیوں میں اس کے بال گھنے ہوتے ہیں۔ اس لیے اس درمیان میں مارے گئے بھالو کی کھال قیمتی ہوتی ہے۔ کھال سے کمبل، کوٹ، ٹوپیاں وغیرہ بنائی جاتی ہیں۔

بھالو کو رنگ، وزن، بال کے حساب سے الگ الگ قسموں میں بانٹا گیا ہے۔

کالا بھالو: یہ سب سے اہم بھالو ہے اور سیدھا سادہ ہوتا ہے۔ چڑیا گھروں اور میوزیم میں اسے دیکھا جا سکتا ہے۔ سکھائے جانے پر یہ کئی طرح کے کرتب اور کھیل دکھا سکتا ہے۔

جن سے لوگوں کی تفریح ہوتی ہے۔ یہ شمالی امریکہ کے دوسرے سبھی بھالوؤں سے چھوٹا ہوتا ہے۔ اس کا اوسط وزن 200 سے 350 پاؤنڈ تک ہوتا ہے۔ زیادہ تر بھالو کالے ہوتے ہیں مگر اس نسل کے کچھ بھالوؤں کی ناک کے اوپر اور کچھ کے سینے پر سفید داغ ہوتا ہے۔ کچھ بھالوؤں کے بال بھورے بھی ہوتے ہیں۔ اپنے وزن اور قد کی وجہ سے یہ تیزی سے دوڑ اور پیڑوں پر چڑھ بھی سکتے ہیں۔ ان میں سے کچھ بھالو خطرناک بھی ہوتے ہیں جو کہ دیکھنے میں شرمیلے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ چھیڑنے یا۔ سردیوں کے درمیانی وقت میں مادہ بچے دیتی ہے۔

یہ بچے سات سے نو انچ لمبے اور تقریباً آدھا پاؤنڈ وزن دار ہوتے ہیں۔ بچوں کے جسم پر بال کم ہوتے ہیں اور آنکھیں ایک مہینے تک بند رہتی ہیں۔قریب دو ماہ کے بعد ہی یہ اپنی ماند سے باہر نکلتے ہیں۔کالے بھالو کی عمر پندرہ سے پچیس برس تک ہوتی ہے۔

سفید بھالو: یہ شمالی امریکہ کے سبھی جانوروں سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔اس کا وزن 1000 (ایک ہزار) پاؤنڈ تک ہوتا ہے۔ یہ بھورے پیلے سیاہی مائل رنگ کے ہوتے ہیں۔ ان کے پنجے بڑے ہوتے ہیں لیکن ناخن نکیلے نہ ہونے کے سبب یہ درختوں کے اوپر کم جا پاتے ہیں۔ یہ میکسیکو سے شمالی الاسکا تک اور دوسرے علاقوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ ہرن، بھینس، گھوڑا اور دیگر جانوروں پر بھی حملہ کردیتے ہیں۔ اب ان کی تعداد شکار کے سبب کافی کم ہوگئی ہے اور یہ صرف گھنے جنگلوں میں ہی ملتے ہیں۔ یہ سردیوں میں گہری نیند میں نہ رہ کر سبھی موسموں میں دن رات اپنے شکار کی تلاش میں گھومتے رہتے ہیں۔

قطبی بھالو: یہ امریکہ اور ایشیا کے قطبی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ سیل، والرس مچھلیاں اور دوسرے مرے ہوئے جانور ان کی خاص غذا ہے۔ یہ ہوشیار تیراک بھی ہوتے ہیں۔ یہ بھالو صرف منطقہ بارده (ٹھنڈے علاقوں) تک ہی محدود رہتے ہیں۔

بھورے بھالو: یہ یورپ اور ایشیا میں ملتے ہیں، انھیں باندھ کر پالتو بھی بنایا جاسکتا ہے۔انھیں بھالوؤں سے انگلینڈ میں سیکڑوں برس تک ایک طرح کا کھیل دکھایا جاتا رہا ہے،جس میں کئی کتوں کو ایک ہی بار میں بھالو کے اوپر حملہ کرنے کے لیے چھوڑا جاتا ہے۔ ہندوستان میں اس نسل کے بھالو ہمالیہ کے پہاڑی علاقوں میں پائے جاتے ہیں۔ اس کی لمبائی سات فٹ ہوتی ہے۔

سلوتھ بھالو: یہ ہندوستان اور لنکا میں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ اس کے بال کالے اور لمبے ہوتے ہیں۔ پنجہ بھی لمبا ہوتا ہے۔ یہ شہد اور چھوٹے کیڑوں مکوڑوں کو کھاتا ہے۔ یہ بھالو ملیشیا، بورنیو اور سماترا میں بھی پایا جاتا ہے۔

■

Akbar Khan Askh
Mohalla: Habshiyan, Fort Road
Jalore - 343001 (Rajasthan)
Mob.: 9413384093

مہاتما گاندھی

ورزش

صحت ہی زندگی ہے، یہ مہاتما گاندھی نے کہا تھا۔ کچھ اسی طرح کی بات اردو کے ایک شاعر نے بھی کہی ہے:

تنگ دستی اگر نہ ہو سالک   تندرستی ہزار نعمت ہے

صحت اور تندرستی زندگی کے لیے بہت لازمی ہیں۔ ذہنی صحت کے لیے جسمانی صحت کی ضرورت پڑتی ہے اسی لیے اگر شروع سے ہی صحت اور تندرستی کے تعلق سے لاپرواہی کے بجائے بیداری کا رویہ اختیار کیا جائے تو انسان بہت ساری بیماریوں سے بچ سکتا ہے۔ ہمارے عہد میں بچوں کی صحت ایک بڑا مسئلہ ہے، اس پر سنجیدگی سے توجہ دیے جانے کی ضرورت ہے۔ بچوں کی صحت کے تعلق سے 'بچوں کی دنیا' میں یہ کالم اس لیے شروع کیا گیا ہے تاکہ والدین کے ساتھ ساتھ بچے خود بھی اپنی صحت اور تندرستی کا خیال رکھ سکیں۔

ورزش انسان کے لیے ایسے ہی ضروری ہے جیسے ہوا، پانی اور غذا کیونکہ جو شخص پابندی سے ورزش کرے گا کبھی بیمار نہیں پڑ سکتا۔ ورزش سے ہماری مراد صرف پیدل چلنا، یا ہاکی، فٹ بال اور کرکٹ کھیلنا نہیں ہے بلکہ اس میں ہم ہر قسم کی جسمانی اور دماغی محنت شامل کرتے ہیں۔ غذا کی طرح ورزش بھی جسم اور دماغ دونوں کے لیے یکساں ضروری ہے۔ ورزش نہ کرنے سے دماغ اتنا ہی کمزور ہوتا ہے جتنا کہ جسم اور کمزور دماغ دراصل بیماری کی ایک صورت ہے۔

ایک پہلوان جو کشتی میں ماہر ہو حقیقی معنوں میں اس وقت تک تندرست نہیں سمجھا جا سکتا جب تک کہ اس کا دماغ بھی اتنا ہی اچھا نہ ہو۔ اس لیے جیسا کہ اوپر بیان ہوا کامل تندرستی اسی وقت سمجھی جائے گی جب کہ جسم اور دماغ دونوں تندرست ہوں۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ وہ کون سی ورزشیں ہیں جو جسم اور دماغ دونوں کے لیے یکساں مفید ہیں۔ درحقیقت قدرت نے ایسا انتظام کیا ہے کہ ہم وقت واحد میں جسمانی اور دماغی دونوں کام کر سکتے ہیں۔ دنیا میں بیشتر تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو زراعت پیشہ ہیں۔ کسان کو سخت جسمانی محنت کرنی پڑتی ہے کیونکہ اسے روٹی کپڑا حاصل کرنے کے لیے دن میں دس گھنٹہ اور بعض وقت اس سے بھی زیادہ کام کرنا پڑتا ہے اور

جب تک دماغ اچھی حالت میں نہ ہو جسمانی مشقت ممکن نہیں۔ کسان کو کاشتکاری کے تمام اصول پیش نظر رکھنے پڑتے ہیں۔ اس کو زمین اور موسم کے متعلق وسیع معلومات کی ضرورت ہے اور چاند سورج ستاروں کی گردش کا بھی علم ہوتا ہے۔ ان چیزوں میں قابل ترین لوگ بھی کسان کی برابری نہیں کر سکتے۔ اس کو اپنے گرد و نواح کی حالت بخوبی معلوم ہوتی ہے۔ وہ رات کے وقت ستارے دیکھ کر راستے معلوم کر لیتا ہے اور چرند و پرند کے اوضاع و اطوار سے بہت سی باتیں بتا سکتا ہے مثلاً جب ایک خاص قسم کے پرندے جمع ہو کر شور مچاتے ہیں تو وہ بتا سکتا ہے کہ اب مینہ برسنے والا ہے، غرض زمین و آسمان کے متعلق جس قدر معلومات اس کے لیے ضروری ہیں وہ سب اسے حاصل ہوتی ہیں چونکہ اسے اپنی اولاد کی تربیت کرنی پڑتی ہے وہ دھرم شاستر کے احکام سے بھی کچھ واقفیت رکھتا ہے اور ہمیشہ زیرِ سما رہنے سے اسے خدا کی عظمت کا بہ آسانی احساس ہوتا رہتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ سب لوگ زراعت پیشہ نہیں ہو سکتے اور نہ یہ باب ان سے متعلق ہے۔ ہم نے کاشتکار کی زندگی کا نقشہ صرف اس لیے یہاں پیش کیا کہ ہماری رائے میں انسان کے لیے یہ بالکل مطابق فطرت زندگی ہے۔ ہم جتنا اس سے ہٹتے جائیں گے اتنی ہی ہماری صحت خراب ہوگی۔ کاشتکار کی زندگی سے یہ سبق ملتا ہے کہ ہمیں دن میں کم سے کم آٹھ گھنٹے کام کرنا چاہیے جس میں دماغی کام بھی شامل ہو۔ تاجر اور دوسرے پیشہ ور جو ایک جگہ بیٹھے رہتے ہیں انھیں اگرچہ کچھ دماغی کام کرنا پڑتا ہے لیکن وہ اس قدر ناکافی اور اس نوعیت کا ہوتا ہے کہ اسے ورزش نہیں کہہ سکتے۔

ایسے لوگوں کے لیے حکمائے مغرب نے فٹ بال، کرکٹ کے علاوہ بعض ایسے چھوٹے چھوٹے کھیل بھی وضع کیے ہیں۔ جو جلوس اور دوسرے تقاریب کے موقعے پر کھیلے جاتے ہیں۔ دماغی محنت کے لیے ایسی کتابوں کا مطالعہ تجویز کیا گیا ہے جس سے دماغ پر بار نہ پڑے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کھیلوں سے جسمانی ورزش تو ہوتی ہے لیکن یہ غور طلب ہے کہ کیا دماغ کے لیے بھی وہ ایسے ہی مفید ہیں؟ کتنے اعلیٰ فٹ بال اور کرکٹ کھیلنے والے ایسے ملیں گے جن کے ذہنی قویٰ غیر معمولی ہوں! ہندوستان کے جو والیانِ ریاست ممتاز کھلاڑی سمجھے جاتے ہیں انھوں نے کون سی دماغی قابلیت کا ثبوت دیا ہے، اس کے برخلاف ملک کے کتنے قابل ترین افراد ایسے ہیں جو ان کھیلوں میں حصہ لیتے ہوں؟ تجربے کی بنا پر ہم دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ایسے بہت کم لوگ کھیلوں میں دلچسپی لیتے ہیں جنھیں فطرت نے اعلیٰ دماغی قابلیت عطا کی ہے۔ انگلستان کے باشندے کھیلوں کے بڑے شوقین ہیں لیکن خود انہی کا مشہور شاعر کپلنگ کھلاڑیوں کے ذہنی قویٰ کے متعلق نہایت غیر حوصلہ افزا رائے ظاہر کرتا ہے؟

ہندوستانیوں کی حالت اس سے بالکل مختلف ہے، یہاں کے لوگ سخت دماغی کام کرتے ہیں لیکن کسی جسمانی ورزش میں حصہ نہیں لیتے۔ ان کے جسم دماغی کام کی کثرت سے کمزور ہو جاتے ہیں اور عین اس زمانے میں جب کہ دنیا ان کی خدمات سے استفادہ کرنا چاہتی ہے وہ مہلک امراض کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے اس کو خیر باد کہتے ہیں، اس لیے ہمارے مشاغل نہ تو بالکل دماغی ہونے چاہیے نہ بالکل جسمانی اور نہ ایسے جن سے صرف عارضی طور پر لذت اندوز ہونا مقصود ہو۔ بہترین ورزش وہ ہے جو جسم اور دماغ دونوں کو تقویت پہنچائے۔ صرف اسی طرح کی ورزش آدمی کو حقیقی معنوں میں تندرست رکھ سکتی ہے اور کسان ہی وہ شخص ہے جس کے روزانہ مشاغل میں ایسی ورزش داخل ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ایسے لوگ کیا کریں جو کاشتکار نہیں؟ کرکٹ کی طرح کے کھیلوں سے جتنی ورزش ہوتی ہے وہ بالکل کافی نہیں، اس لیے کچھ نہ کچھ اور کرنا چاہیے، عوام کے لیے بہترین صورت یہ ہوگی کہ وہ مکان میں ایک چھوٹا سا باغ لگائیں اور روزانہ چند گھنٹے اس میں کام کریں۔

ممکن ہے کہ بعض لوگ یہ پوچھیں کہ اگر مکان ذاتی نہ ہو تو کیا کیا جائے لیکن یہ احمقانہ سوال ہے کیونکہ کوئی مالک مکان اپنے گھر کی اصلاح سے ناخوش نہیں ہوسکتا اور ہمیں اس احساس سے مسرت ہوگی کہ ہم نے ایک غیر شخص کی زمین اچھی حالت میں رکھی ہے لیکن جن لوگوں کو اس ورزش کے لیے وقت نہ ہو یا اسے پسند نہ کرتے ہوں ان کے لیے چہل قدمی بہت اچھی چیز ہے۔

اس کے متعلق بہت صحیح کہا گیا کہ یہ تمام ورزشوں کی ملکہ ہے۔ ہمارے سادھوؤں اور فقیروں کے طاقتور ہونے کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ وہ شہر کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پیدل پھرتے ہیں۔ امریکہ کے مشہور مصنف تھورو نے چہل قدمی کے متعلق بہت سی عجیب باتیں بیان کی ہیں۔ اس کا قول ہے کہ ''جو لوگ ہمیشہ گھر میں رہتے ہیں اور کبھی کھلی ہوا میں نہیں نکلتے ان کی تصانیف بھی ان کے جسم کی طرح کمزور ہوتی ہیں۔ اپنے ذاتی تجربے کا حوالہ دیتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ ''میری بہترین تصانیف اسی زمانے کی ہیں جب کہ میں بہت چلنے کا عادی تھا۔'' اسے پیدل چلنے کی اس قدر عادت تھی کہ دن میں پانچ چار گھنٹہ چلنا اس کے لیے معمولی بات تھی۔ ہمیں ورزش کا اتنا شوق ہوجانا چاہیے کہ کسی حالت میں ہم اسے ترک نہ کرسکیں۔ ہم اسے بالکل محسوس نہیں کرتے کہ جسمانی ورزش کے بغیر ہمارے دماغی کام کس قدر کمزور اور معمولی ہوتے ہیں۔ پیدل چلنے سے جسم کے ہر حصے کو حرکت ہوتی ہے اور دوران خون تیز ہوتا ہے کیونکہ جس وقت ہم تیز چلتے ہیں۔ تازہ ہوا سانس کے ذریعے پھیپھڑوں میں داخل ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ مناظر قدرت کے مشاہدے سے جو لطف حاصل ہوتا ہے اس کی کوئی حد نہیں۔ گلی کوچوں میں پھرنا یا روز ایک ہی راستے پر جانا تو بیکار ہے ہمیں چاہیے کہ کھیتوں اور جنگلوں میں جایا کریں جہاں قدرت کی نیرنگیوں سے لطف اٹھانے کا موقع ملے، میل دو میل چلنے کا تو چلنے میں شمار ہی نہیں۔ ورزش کے لیے دس بارہ میل چلنا ضروری ہے جو لوگ روز اتنا نہیں چل سکتے وہ کم سے کم ہفتے میں ایک دفعہ تعطیل کے دن تو ایسا کرسکتے ہیں۔

ایک شخص کو سوء ہضم کی شکایت تھی۔ وہ ڈاکٹر کے پاس علاج کے لیے گیا۔ ڈاکٹر نے اسے چہل قدمی کا مشورہ دیا، لیکن مریض نے کمزوری کا عذر کر کے مجبوری ظاہر کی۔ کیونکہ ڈاکٹر اسے اپنی گاڑی میں تفریح کو لے گیا اور راستے میں عمداً کوڑا گرا دیا۔ مریض اخلاقاً کوڑا اٹھانے کے لیے اترا۔ اس کے اترتے ہی ڈاکٹر اس کی واپسی کا انتظار کیے بغیر آگے بڑھ گیا اور بیچارے مریض کو گاڑی کے پیچھے پیدل آنا پڑا۔ جب ڈاکٹر کو اطمینان ہوگیا کہ مریض کافی پیدل چل چکا ہے تو اس نے اسے پھر گاڑی میں بٹھایا اور معذرت کی کہ یہ تدبیر میں نے صرف اس لیے اختیار کی تھی کہ کسی طرح آپ کو پیدل چلنا پڑے۔'' چونکہ اس اثنا میں مریض کو خاصی بھوک معلوم ہونے لگی تھی اسے ڈاکٹر کے مشورے کی قدر ہوئی۔ وہ کوڑے والی بات بھول گیا اور گھر پہنچ کر خوب کھانا کھایا۔ لہٰذا جن لوگوں کو سوء ہضم یا اس قسم کی اور شکایتیں ہوں وہ پیدل چل کر دیکھیں انھیں خود اس ورزش کے فوائد فوراً معلوم ہوجائیں گے۔

■

ماخذ: رہنمائے صحت، **مصنف:** مہاتما گاندھی
مترجم: محمد اعظم خاں، **سنہ اشاعت:** 1930

لفظوں کو ملا کر لکھنا

قواعد زبان میں املا کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ لکھنے والے کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ جو لفظ لکھا جا رہا ہے اس کی صحیح صورت کیا ہے؟ آج کے دور میں املا میں بہت سی تبدیلیاں آچکی ہیں جس کی وجہ سے دشواریاں بھی پیدا ہو رہی ہیں۔ ہمارے بزرگوں نے املا کے مسائل پر خاص طور پر توجہ دی تھی۔ اصلاح املا کمیٹی کی تشکیل بھی اسی نقطۂ نظر سے کی گئی تھی جس نے بہت سی تجاویز بھی رکھیں۔ مولانا احسن مارہروی، ڈاکٹر عبدالستار صدیقی جیسی شخصیات نے املا کی صحت اور اصلاح کے تعلق سے اہم مضامین بھی تحریر کیے ہیں۔ ان کے علاوہ املا پر اردو میں کچھ اہم کتابیں شائع ہوئی ہیں جن میں اصلاح تلفظ (مولانا ابوالخیر صدیقی)، املا نامہ (پروفیسر گوپی چند نارنگ)، اردو املا اور رسم الخط (ڈاکٹر فرمان فتح پوری)، اردو املا اور اس کی اصلاح (ڈاکٹر ابو محمد سحر)، اصلاح تلفظ و املا (طالب الہاشمی)، اردو میں تلفظ (ڈاکٹر یوسف رامپوری) قابل ذکر ہیں۔ ان کتابوں کے مطالعے سے صحیح املا لکھنے میں طلبا کو رہنمائی مل سکتی ہے۔

انجمن ترقی اردو نے اصلاحاتِ املا کے تحت جو تجویزیں منظور کی تھیں، ان میں سے ایک تجویز یہ بھی تھی کہ دو لفظوں کو ملا کر نہ لکھا جائے۔ تجویز یہ تھی:

"مرکب لفظ جو دو یا زیادہ لفظوں سے بنے ہوں، آپس میں ملا کر نہ لکھے جائیں، بل کہ ہمیشہ الگ الگ لکھے جائیں، البتہ ان کے درمیان فاصلہ صرف اتنا ہو، جتنا ایک ہی لفظ کے دو ٹکڑوں کے بیچ میں، جیسا کہ ان مثالوں سے واضح ہوگا، جیسے: آج کل، بن مانس، پن ڈبی، کل جگ، کل منہا، کل دار، شاہ نامہ، شاہ جہاں آباد، شاہ جہاں پور، جے پور، اودے پور، فرخ نگر، ناگ پور، کان پور، دل لگی، گل کاری، پھل کاری۔

بعضے مفرد لفظ دو طرح کے لکھے جاتے ہیں: بی بی اور بیبی، دُل دُل اور دلدل، ان کی منفصل لکھاوٹ اختیار کی جائے، اس طرح: کھل بلی، جھٹ پٹا، جھُن جھنا، کُن کنا، ہل چل، گُل گلا، رس گلا، لس لسا، کھٹ کھٹانا، کھٹ کھٹاہٹ، کھن کھنانا، کھن کھناہٹ، دانتا کِل کل، جھن جھٹ۔ فارسی لفظ بہ، نہ، چہ، کہ، بے وغیرہ جو خود فارسی میں بھی کبھی دوسرے لفظ سے مل کر اور کبھی الگ لکھے جاتے ہیں، اردو عبارت میں الگ لکھے جاویں جیسے: بہ خوبی، بہ ہر حال، بہ کمالِ شفقت، بہ دولت، نہ خورد، نہ گفت، چہ کنم، چہ می گوئی، چہ می گوئیاں، حال آں کہ، بل کہ، چوں کہ، چناں چہ، غرض کہ، تا وقتے کہ، بہ شرطے کہ، بے شک، بے تحاشا، بے محابا وغیرہ۔"

فارسی میں شروع سے اس طرف رجحان رہا ہے کہ مرکبات کو ملا کر لکھا جائے اور اب تو یہ، املائے فارسی کے مسلمہ قواعد میں سے ہے۔ وہاں 'دانش کدہ' لکھنا ٹھیک نہیں۔ اس طرح لکھ دیا جائے تو بہ قول ڈاکٹر صدیقی مرحوم: "پانچ میں سے پورے پانچ نمبر کاٹ لیے جائیں گے" فارسی کی تقلید میں، اردو میں بھی لفظوں کو ملا کر لکھنا، وبائے عام کی طرح پھیل گیا۔ بل کہ ہمارے زمانے کے بعض حضرات تو اس قدر غلو کرتے ہیں کہ 'چلیگا'، 'دلکھینگے' اور 'اٹھینگی' وغیرہ لکھنا ضروری سمجھتے ہیں۔

اردو میں شوشے، جوڑ، نقطے، حرفوں کے مختلف الصورت چھوٹے چھوٹے ٹکڑے، حروف متشابہ یہ سب کچھ اس قدر اور

اس طرح ہیں کہ ان سب کے ساتھ لفظوں کو ملا کر لکھنا، نگاہ کو مزید آزمائش میں مبتلا کرنا اور طالب علم کو حیران کرنا ہے۔

لکھنے اور پڑھنے کی آسانی اس میں ہے کہ لفظوں کو ملا کر نہ لکھا جائے، بل کہ جو مرکبات اب مفرد لفظوں کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اور ان کو آسانی کے ساتھ ٹکڑوں میں بانٹا جاسکتا ہے، ان کو بھی الگ الگ لکھا جائے۔ جیسے: جھن جھٹ اور جھن جھن، دُل دل اور بی بی۔ اس سے لکھنے میں سادگی اور پڑھنے میں آسانی پیدا ہوگی، اور ان دونوں کی اہمیت اور ضرورت سے کون انکار کرسکتا ہے۔ زبان صرف اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں ہی کے لیے نہیں ہوتی، وہ طالب علموں اور کم خواندہ لوگوں کے لیے بھی ہوتی ہے۔ ایک پڑھا لکھا آدمی 'نیکبخت' کے پڑھنے میں کوئی الجھن محسوس نہیں کرے گا، مگر ابتدائی درجوں کے طلبہ اور عمومی سطح کے آدمیوں کو، اس کے لکھنے اور پڑھنے میں، الجھن سے آنکھیں چار کرنا پڑیں گی۔

انگریزی یا دوسری یورپی زبانوں کے ایسے طویل یا نسبتاً طویل لفظوں کو جو کسی خرابی کے بغیر، ٹکڑوں میں تقسیم ہوسکتے ہیں؛ اگر ٹکڑوں میں لکھا جائے، تو املا کی صحت، تلفظ کی صحت، اور لکھنے کی آسانی؛ یہ تینں چیزیں حاصل ہوسکتی ہیں۔ جیسے: گل کرسٹ، یونی ورسٹی، کان فرنس، پارلی منٹ، کانس ٹی ٹیوشن۔

مختصر نویسی، اردو تحریر کا امتیازی وصف ہے، مگر اس کو ایک حد کے اندر رہنا چاہیے۔ اگر اس سے تلفظ اور کتابت، دونوں کو الجھن ہوتی ہو، تو اس سے فائدہ؟ اور اگر اس طرح نہ لکھنے سے دونوں آسانیاں ہاتھ آتی ہوں اور لفظ پر کوئی اثر نہ پڑتا ہو، تو کیا برائی ہے۔

پھر یہ بھی دیکھیے کہ ایسے حرف بھی تو ہیں جو اپنے بعد آنے والے حرف سے ملا کر لکھے ہی نہیں جاسکتے؛ جب یہ حرف بیچ میں آجاتے ہیں تو لفظ خود بہ خود ٹوٹ جاتا ہے اور دو یا زیادہ ٹکڑوں میں بٹ جاتا ہے، جیسے: فرفر اور پڑھاؤں گا۔ جو لوگ 'لکھینگے' لکھنے پر اصرار کرتے ہیں، وہ 'پڑھاؤں گا' کو کس طرح لکھیں گے؟ اور 'پڑھ رہا ہوں' کو کیا 'پڑھرہا ہوں' لکھنا پسند کریں گے؟ اور کیا 'کمقسمت' لکھنا گوارا کریں گے،

مختصر یہ کہ (الف) دو لفظوں کو ملا کر نہیں لکھا جائے گا، خواہ وہ اسم ہوں، جیسے خوب صورت، کہ اس کو 'خوبصورت' نہیں لکھا جائے گا اور خواہ فعل ہوں، جیسے: جائے گا، چل گیا، لکھیں گے۔ اگر 'جائیگا' یا 'لکھینگے' لکھا جائے گا تو اس کو قابل اعتراض سمجھا جائے گا۔ ہر صورت میں، افعال کے ساتھ ان کے ایسے لاحقوں کو الگ لکھا جائے گا۔

(ب) اسموں کے ساتھ جو سابقے آتے ہیں، ان کو بھی عموماً الگ الگ لکھا جائے گا۔ جیسے: بہ خوبی، اَن پڑھ، بے ڈھنگا، بے دخلی۔

(ج) کہ، چہ وغیرہ کو بھی الگ لکھا جائے گا، جیسے کیوں کہ، بل کہ، چناں چہ۔

(د) جو مفرد لفظ آسانی کے ساتھ ٹکڑوں میں تقسیم ہوسکتے ہیں، ان کو علاحدہ علاحدہ لکھا جائے گا، جیسے: بی بی، دل دل، کھل بلی۔

(ہ) انگریزی کے لفظوں کو جہاں تک ممکن ہوگا، اس طرح لکھا جائے گا کہ وہ زیادہ سے زیادہ ٹکڑوں میں تقسیم ہوسکیں۔

اردو میں مرکبات کی تعداد بہت ہے۔ اس کے علاوہ، سابقوں اور لاحقوں سے مرکب ہونے والے الفاظ کی بھی بڑی تعداد ہے۔

■

ماخذ: اردو املا، **مصنف:** رشید حسن خاں، **پانچویں طباعت:** 2019، **ناشر:** قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

گلشن

چمن چمن کے پھول

شاعری میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے تحریر و تقریر میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، خطاب میں زور اور تحریر میں قوت پیدا کرنے کے لیے اشعار کا استعمال بہت کارگر ہوتا ہے۔ پرانے زمانے کے لوگوں کو استاد شعرا کے ہزاروں اشعار یاد ہوا کرتے تھے اور وہ موقعے کی مناسبت سے ان اشعار کا استعمال بھی کیا کرتے تھے۔
'چمن چمن کے پھول' میں مختلف رنگ اور شاعروں کے شعر اس لیے دیے جاتے ہیں تاکہ بچے موضوع کی مناسبت سے اچھے اشعار یاد کریں اور اپنی تحریر و تقریر میں اشعار کا موزوں اور برمحل استعمال کر سکیں۔ (ادارہ)

وطن کی خاک سے مر کر بھی ہم کو انس باقی ہے
مزہ دامان مادر کا ہے اس مٹی کے دامن میں

—چکبست برج نرائن

دل سے نکلے گی نہ مر کر بھی وطن کی الفت
میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی

—لال چند فلک

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

—علامہ اقبال

دکھ میں سکھ میں ہر حالت میں بھارت دل کا سہارا ہے
بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیشوں سے پیارا ہے

—افسر میرٹھی

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے
دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

— بسمل عظیم آبادی

وطن کا ذرّہ ذرّہ ہم کو اپنی جاں سے پیارا ہے
نہ ہم مذہب سمجھتے ہیں نہ ہم ملت سمجھتے ہیں

— آنند نرائن ملا

ہم خون کی قسطیں تو کئی دے چکے لیکن
اے خاک وطن قرض ادا کیوں نہیں ہوتا

—والی آسی

وطن کے جاں نثار ہیں وطن کے کام آئیں گے
ہم اس زمیں کو ایک روز آسماں بنائیں گے

— جعفر ملیح آبادی

وطن کی خاک ذرا ایڑیاں رگڑنے دے
مجھے یقین ہے پانی یہیں سے نکلے گا

—نامعلوم

اس ملک کی سرحد کو کوئی چھو نہیں سکتا
جس ملک کی سرحد کی نگہبان ہیں آنکھیں

—نامعلوم

ہے محبت اس وطن سے اپنی مٹی سے ہمیں
اس لیے اپنا کریں گے جان و تن قربان ہم

—نامعلوم

وطن کی پاسبانی جان و ایماں سے بھی افضل ہے
میں اپنے ملک کی خاطر کفن بھی ساتھ رکھتا ہوں

—نامعلوم

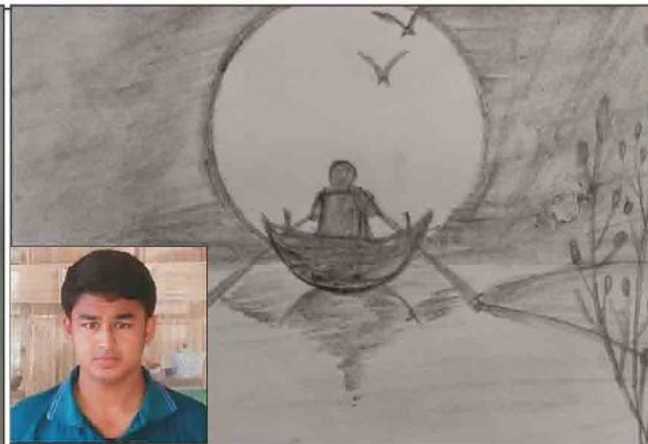

شاہنواز ابراہیم، درجہ ڈی ایل ایڈ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی (مین کیمپس)، گچی باؤلی، حیدر آباد

روا فطین درجہ ہفتم، سہیل فرقان، انجمن انگلش اسکول، خام گاؤں، مہاراشٹر

انایا فاطمہ، عبدالحسب، درجہ سوم، اسکالر انگلش اسکول
اسلام دروازہ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

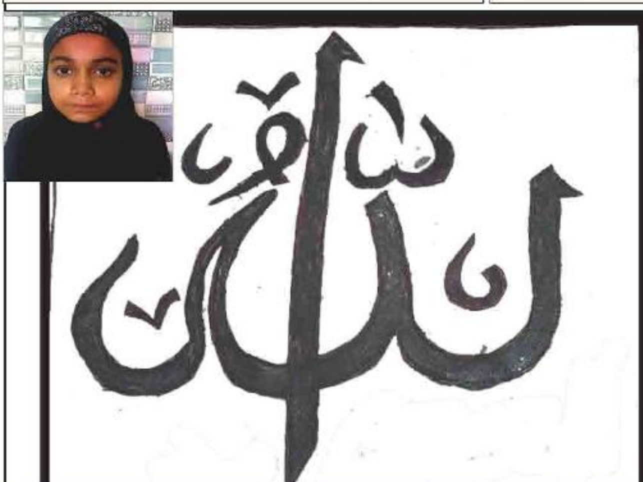

انعم فاطمہ، کلاس ششم، الغزالی انٹرنیشنل اسکول، ارریہ، بہار

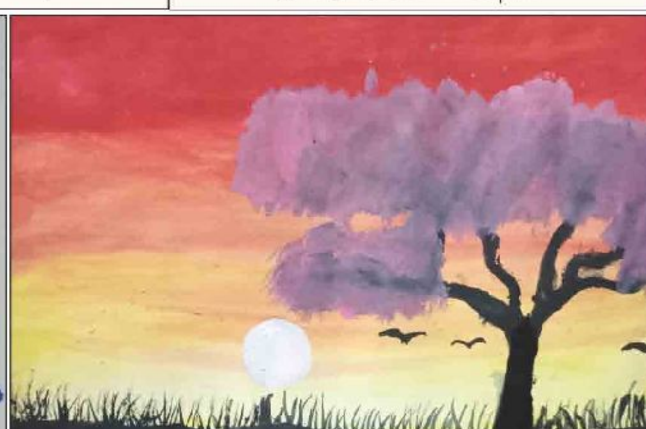

محمد کاشف، سروش انگلش اسکول مٹمیٹا، اورنگ آباد، مہاراشٹر

مشکٰہ رضوی، درجہ دہم، گڈ اسمرٹن اسکول، جسولہ، نئی دہلی

قلمکاروں سے چند باتیں

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ایک مقبول رسالہ ہے۔ جس میں بچوں کے ذہن اور نفسیات کو نظر میں رکھتے ہوئے معلوماتی مضامین، دلچسپ کہانیاں، پیاری پیاری نظمیں اور دیگر مفید تحریریں شائع کی جاتی ہیں۔ اس رسالے میں کوشش کی جاتی ہے کہ پورے ہندوستان کی نمائندگی ہو مگر بسیار کوشش کے باوجود بہت سے علاقوں کی متناسب نمائندگی نہیں ہو پاتی ہے۔ ایسے علاقوں کے ادیبوں کی جستجو ہماری ترجیحی فہرست میں شامل ہے۔

- رسالے میں بچوں کے ادیبوں کے تعارف اور تصویر کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا ہے تاکہ بچوں کے ادیبوں کی ڈائرکٹری ترتیب دینے والوں کو مدد مل سکے۔
- معلومات عامہ، صحت، زبان شناسی، تاریخ، تہذیب، سائنس و ٹیکنالوجی، جغرافیہ، آثار قدیمہ اور اہم شخصیات سے متعلق تخلیقات ترجیحی طور پر شائع کی جائیں گی۔
- 'مستقبل کے قلمکار' عنوان کے تحت بچوں کی تحریروں کو خاص طور پر شائع کیا جائے گا۔
- بچوں کے ادیبوں کے انٹرویوز اور رسائل کے مدیران پر ایک سیریز شروع کی جائے گی۔

قلمکاروں سے گذارش ہے کہ بچوں کی دنیا کے لیے تحریریں بھیجتے وقت درج ذیل امور کا خاص خیال رکھیں:

- بچوں کے لیے صرف وہی تخلیق ارسال کریں جس سے ان کی معلومات اور آگہی میں اضافہ ہو، خاص طور پر وہ تحریریں جو بچوں میں مطالعے کی تحریک اور ترغیب پیدا کریں۔
- تخلیق کی زبان آسان ہو، مشکل الفاظ سے گریز کریں تو بہتر ہوگا۔
- تخلیق غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/ مجلّے میں ارسال نہ کی گئی ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 1200 (بارہ سو) الفاظ سے کم اور 2000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون کے ساتھ اپنا تعارف مع تصویر ارسال فرمائیں۔ تعارف میں بچوں کے لیے لکھی گئی کتابوں اور مضامین کا اندراج ضرور فرمائیں۔
- مضمون میں اعداد و شمار رومن میں لکھیں۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- تخلیق کی اشاعت کے درمیان کم سے کم تین (3) ماہ کا فاصلہ لازمی ہے۔ اس سے کم مدت میں تخلیق کی اشاعت کے لیے اصرار نہ فرمائیں۔
- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' کو زیادہ مفید مطلب بنانے کے لیے آپ سب کے مشوروں اور تعاون کی ضرورت ہے۔

—ادارہ

बच्चों की दुनिया मासिक, अगस्त 2022, वर्ष 10, अंक 08
BACHON KI DUNIYA Monthly, August 2022 Vol. 10, Issue: 08
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439/2022-24
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/07/2022
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

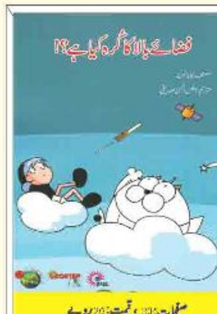

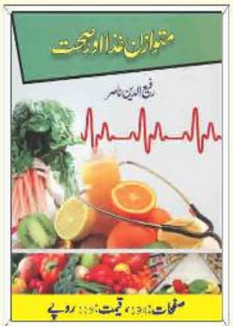

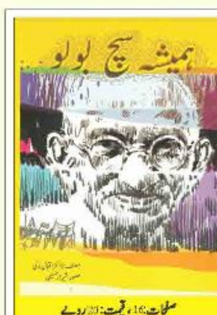

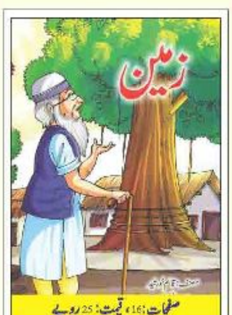

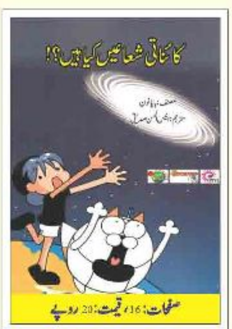

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.
LPC DELHI,DELHI PSO,DELHI RMS,DELHI-6